# منتخبات اردو

مرتّبہ

پروفیسر شیخ حضرت ایم اے

بمبئی بک ہاؤس بمبئی نمبر ۳

# منتخبات اردو

## فہرست نظم

## غزلیات

# قطعات

# مثنویات

# مسدسات

# رباعیات

# قصائد

# سوانح حیات

# اُردو کی کہانی

(میر امّن دہلوی)

سبحان اللہ کیا صانع ہے کہ جس نے ایک مُٹھی خاک سے کیا کیا صورتیں اور مٹی کی مورتیں پیدا کیں! باوجود دو رنگ کے ایک گورا اور ایک کالا اور یہی ناک کان ہاتھ پاؤں سب کو دیئے ہیں تس پر رنگ برنگ کی شکلیں جدی جدی بنائیں کہ ایک کی سج دھج سے دوسرے کا ڈیل ڈول ملتا نہیں۔ کروڑوں خلقت میں جس کو چاہیے پہچان لیجئے۔ آسمان اس کے دریائے وحدت کا ایک بُلبُلا ہے۔ اور زمین پانی کا بتاشہ، لیکن یہ تماشہ ہے کہ سمندر ہزاروں لہریں مارتا ہے پر اس کا بال بیکا نہیں کرسکتا۔ جس کی یہ قدرت اور سکت ہو اس کی حمد و ثنا میں زبان انسان کی گویا گونگی ہے کہیئے تو کیا کہیئے۔ بہتر یوں ہے کہ جس بات میں دم نہ مار سکے، چپکا ہو رہے۔

منشا اس تالیف کا یہ ہے کہ سن ایک ہزار دو سو پندرہ برس ہجری اور اٹھارہ سو ایک سال عیسوی ایک ہزار دو سو سات سن فصلی کے عہد میں (اشرف الاشراف مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل، لارڈ مارننگٹن

صاحب کہ جن کی تعریف میں عقل حیران اور فہم سرگرداں ہے۔ جتنے وصف سرداروں کو چاہیئے اُن کی ذات میں خدا نے جمع کئے ہیں۔ غرض قسمت کی خوبی اس ملک کی تھی جو ایسا حاکم تشریف لایا جس کے قدم کے فیض سے ایک عالم نے آرام پایا۔ مجال نہیں کہ کوئی کِسو پر زبردستی کر سکے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ سارے غریب و غربا دعا دیتے ہیں اور اور جیتے ہیں۔ چرچا علم کا پھیلا۔ صاحبان ذی شان کو شوق ہوا۔ اردو کی زبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گفت و شنود کریں اور ملکی کام کو بہ آگاہی انجام دیں۔ اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال بموجب فرمائش کے تالیف ہوئیں۔

جو صاحب دانا اور ہندوستان کی زبان بولنے والے ہیں ان کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ یہ قصہ چار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخش جو ان کے پیر تھے اور درگاہ ان کی دلی میں قلعے سے تین کوس لال دروازے کے باہر مٹیا دروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے۔ ان کی طبیعت ماندی ہوئی تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمار داری میں حاضر رہتے اللہ

نے چند روز میں شفا دی، تب اُنہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اِس قصّے کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصّہ فارسی میں مُروّج ہوا۔

اب خداوند نعمت صاحب مروت نجیبوں کے قدر داں جان گِل گرِسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تلک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ اس قصّے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو اور مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا۔ جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔

پہلے اپنا احوال یہ عاصی گنہگار میر امّن دِلّی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کی رکاب میں پُشت بہ پُشت جانفشانی بجا لاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدر دانی جتنی چاہیے فرماتے رہے جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کر مالامال اور نہال کر دیا۔ اور خانہ زاد موروثی اور منصب دار قدیمی زبانِ مبارک سے فرمایا۔ چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اس گھر سے آباد تھے۔) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے (عیاں

راجہ بیان) تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کرلیا
اور احمد شاہ درّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی
کھاکر ویسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول
نال وہیں گڑا ہے) جلا وطن ہوا۔ اور ایسا جہاز (کہ جس کا
ناخدا بادشاہ تھا) غارت ہوا۔ میں بیکسی کے سمندر میں غوطے
کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے۔ کتنے برس
بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے
بھی پانوں اکھڑے روزگار نے مسافت نہ کی۔ عیال و
اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہو اشرف البلاد
کلکتے میں آب و دانہ کے زور سے آپہنچا۔ چندے بیکاری
گذری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی
میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو
سال کے وہاں رہنا ہوا۔ لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا تب منشی
میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گل گرسٹ
صاحب بہادر (دام اقبالہ) کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع
کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے۔ چاہیئے کہ
دن کچھ بھلے آویں نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا
کھاکر پانو پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی
چھوٹے بڑے پرورش پاکر دعا اس قدر دان کو کرتے
ہیں۔ خدا قبول کرے۔

یوں سُنی ہے کہ دِلّی شہر ہندوؤں کے نزدیک جو جگی ہے انہیں کے راجا پرجا قدیم وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمدورفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ پھر ہمایوں بادشاہ پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہوکر ولایت گئے۔ آخر وہاں سے آکر پسماندوں کو گوشمالی دی۔ کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئی۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے۔ ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔ جب حضرت شاہ جہاں صاحب قران نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ کو تعمیر کروایا اور تخت طاؤس میں جواہر جڑوایا اور دَل بادل سا خیمہ چوبوں پر استادہ کر طنابوں سے کھنچوایا۔ اور

نواب علی مرداں خاں نہر کو لے کر آیا۔ تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ تب سے شاہ جہاں آباد مشہور ہوا۔ (اگرچہ دِلّی جدی ہے وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اُردوئے معلا خطاب دیا۔

امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تک پیڑھی در پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی۔ ندان زبان اُردو کی منجھتے منجھتے ایسی منجھی کہ کسو شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی۔ لیکن قدر دان منصف چاہیے جو تجویز کرے۔ سو اب خدا نے بعد مدت کے جان گل گرسٹ صاحب سا دانا، نکتہ رس پیدا کیا جنہوں نے اپنے گیان اور گت سے اور تلاش اور محنت سے قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں۔ اس سبب سے ہندوستان کی زبان کا ملکوں میں رواج ہوا اور نئے سر سے رونق زیادہ ہوئی۔ نہیں تو اپنی دستار و گفتار و رفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا تھا۔ اگر ایک گنوار سے پوچھئے تو شہر والے کو نام رکھتا ہے اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے خیر عاقلاں خود می دانند۔

جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا شاہ عالم پورب کی طرف تھے کوئی وارث اور مالکِ ملک نہ رہا۔ شہر بے سر ہو گیا۔ سچ ہے بادشاہت کے اقبال

سے شہر کی رونق تھی۔ ایک بارگی تباہی پڑی۔ رئیس
وہاں کے "میں کہیں تم کہیں" ہو کر جہاں جس کے سینگ
سمائے وہاں نکل گئے۔ جس ملک میں پہنچے وہاں کے آدمیوں
کے ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا اور بہت ایسے
ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلّی میں گئے اور رہے
وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں
گے۔ اور جو شخص سب آفتیں سہ کر دِلّی کا روڑا ہو کر رہا
اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار
اُمراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر تماشا اور
کوچہ گردی اس شہر کی مدت تلک کی ہوگی اور وہاں سے
نکلنے کے بعد اپنی زبان کا لحاظ رکھا ہوگا۔ اس کا بولنا البتہ
ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا
دیکھتا یہاں تلک پہنچا ہے۔

(باغ و بہار)

# عہدِ شاہی کا لکھنؤ

(مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی)

یہ پنبہ دہاں ہیچ مداں، محررِ داستاں، مقلدِ گزشتگاں رجب علی بیگ سرور متوطنِ خطۂ بے نظیر دل پذیر رشکِ جناں مسکنِ حور و غلماں، جائے مردم خیز باشندہ یہاں کے ذکی و فہیم عقل کے تیز اگر دیدۂ انصاف و نظرِ غور سے اس شہر کو دیکھئے تو جہاں کی دید کی حسرت نہ رہے آنکھ بند کرے۔

شعر

سنا رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے
وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

سبحان اللہ و بحمدہ عجب شہر گلزار ہے۔ ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طور پر قطع دار ہے۔ دو رویہ بازار کس انداز کا ہے۔ ہر دکان میں سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ ہر چند ہر محلّے میں جہاں کا ساز و سامان مہیا ہے۔ پر اکبری دروازے سے جلو خانے اور پکّے پل تک کہ صراطِ مستقیم ہے کیا جلسہ ہے۔ نان بائی خوش سلیقہ شیرمال، کباب، نان نہاری۔ جہان کی نعمت اس آبداری کی جس کی بو باس سے دل طاقت پائے۔ دماغ معطر ہو جائے۔ فرشتہ گذرے تو سونگھے۔ کیسا ہی سیر ہو ذرا نہ دیر ہو۔ دیکھے سے بھوک لگ آئے۔ وہ سُرخ سُرخ

پیاز سے نہاری کا بگھار، سریلی جھنکار۔ شیرمال شنگرف کی رنگ کی خستہ بُھربھری۔ ایک بار کھائے نان نعمت کا مزہ پائے۔ تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔ کباب اس آب و تاب کے کہ مُرغ ماہی کا دل سیخ آہ پر حسرت محرومی سے کباب، ادرک کا لچھا میاں خیراللہ کی دکان کا کترہ ہاضم و باریک نایاب۔ حبشی[1] کے حلوے سوہن پر عجیب جوبن اس کی شیرینی کی گفتگو میں لب بند جہاں کو پسند، پیڑے و پیر لیسے بسائے۔ ہونٹ سے کھائے۔ دانت کا تمام عمر اس پر دانت رہے۔ لگانے کی نوبت نہ آئے۔ اچُوزی[2] خواب۔ حبشی[3] اہل ہند کو مرغوب، دُودھیا۔ شیرخوارہ نوش کر جائے۔ ہر کنجڑن کی وہ تیکھی چتون، آدمی صورت دیکھتا رہے۔ رعب حسن سے بات نہ کر سکے۔ پری زاد سرو قامت رشک شمشاد۔ دکانوں میں انواع و اقسام کے میوے۔ قرینے سے چنے۔ روز مرّے محاورے ان کے دیکھے نہ سنے۔ کبھی کوئی پکار اُٹھی "میاں ٹکے کو ڈھیر لگایا ہے" کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سُنائی "مزہ انگور کا ہے رنگتروں میں"، کسی طرف یہ صدا آئی "گنڈیریاں پونڈے کی" ایک طرف تنبولی سرخ روئی سے یہ رمز دکھایا یہ کرتے بولی "ٹھولی میں چبا چبا کر ہردم یہ دم بھرتے "مکھی کا منہ کالا

---

[1] اخروٹ کا حلوہ سوہن [2] ایک قسم کا سیاہ حلوہ سوہن [3] ایک قسم کا پان

پیاز سے نہاری کا بگھار، سریلی جھنکار۔ شیرمال شنگرف
کی رنگ کی خستہ بُھربھری۔ ایک بار کھائے نان نعمت
کا مزہ پائے۔ تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔ کباب
اس آب و تاب کے کہ مُرغ ماہی کا دل سیخ آہ پُرحسرت
محرومی سے کباب، ادرک کا لچھا میاں خیراللہ کی دکان
کا کترہ ہاضم و باریک نایاب۔ حبشی کے حلوے سوہن
پر عجیب جوبن اس کی شیرینی کی گفتگو میں لب بند
جہاں کو پسند، پپڑے و پیرلیے بسائے۔ ہونٹ سے
کھائے۔ دانت کا تمام عمر اس پر دانت رہے۔ لگانے
کی نوبت نہ آئے۔ اخروٹی[۱] خوب۔ حبشی[۲] اہل ہند کو
مرغوب، دودھیا۔ شیرخوارہ نوش کر جائے۔ ہرکنجڑن
کی وہ تیکھی چتون، آدمی صورت دیکھتا رہے۔ رعب
حسن سے بات نہ کرسکے۔ پری زاد سرو قامت رشک
شمشاد۔ دکانوں میں انواع و اقسام کے میوے۔
قرینے سے چنے۔ روز مرّے محاورے ان کے دیکھے
نہ سنے۔ کبھی کوئی پکار اُٹھی "میاں ٹکے کو ڈھیر لگایا ہے"
کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سُنائی "مزہ انگور کا ہے
رنگتروں میں" کسی طرف یہ صدا آئی "گنڈیریاں پونڈے کی"
ایک طرف تنبولی سرخ روئی سے یہ رمز و کنایہ کرتے بولی
"ڈھولی میں چبا چبا کر ہردم یہ دم بھرتے "مگھی[۳] کا منہ کالا

---

۱؎ اخروٹ کا حلوہ سوہن ۲؎ ایک قسم کا سیاہ حلوہ سوہن ۳؎ ایک قسم کا پان

ٹھوبا گرد کر ڈالا۔ عبیر ہے نہ گلال ہے۔ کتھے چونے سے اُدھی میں نکھرا لال ہے۔" گلبوں میں گجردم یہ آواز آتی" شیرمال ہے گھی دودھ کی مفلس کا دل اُچاٹ ہے۔ ٹکوں کی چاٹ ہے۔ کدھر لینے والے ہیں۔ نمش[1] کی قفلیاں، کھیر کے پیالے ہیں کیا خوب بُھنے بُھر بُھرے ہیں۔ چنے پر ل اور مُرمُرے ہیں۔ جیٹھ بیساکھ کی وہ گرمی جس میں چیل انڈا چھوڑتی دو پیسے کو برف کی "قفلی جمی" دو کھائے بدن تھرائے۔ زیادہ ہوسکا کرے لقوے فالج میں مرے۔ سر چوک ہمیشہ شانے سے شانہ چھلا۔ نسیم صبا کو سیدھا راستہ نہ ملا۔ شیخ کولی کی مٹھائی جس نے کھائی جہان کی شیرینی سے دِل کھٹا ہوا۔ بنارس کا کھجلا بھولا متھرا کے پیڑے کا ٹھٹھا ہوا۔ برفی کی نفاست، بوباس در دراین نقرئی ورق کا جوبن کسی اور شہر کا رکاب دار اگر دیکھ پائے یا ذائقہ لب پر آئے زندگی تلخ ہو۔ ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے۔ امرتی مسلسل کا ہر پیچ ذائقہ کو پیچ و تاب دیتا۔ یاقوتی مفرح کا مزا جب منہ میں رکھا اصل تو یہ ہے عسل مصفیٰ جنّت کی نہر کا حلق سے اُترا۔

---

[1] ہمیر پور کے ضلع میں ایک پرانا قصبہ جہاں کے پان مشہور ہیں
[2] دودھ کے جھاگ میں مصری ڈال کر کھاتے ہیں۔

بالائی جس دکان پر نظر آئی بے قند و شکر شکر کر کر چھری سے کاٹ کر کھائی۔ مدار بیے حقے وہ ایجاد ہوئے کسگر[1] ایسے استاد ہوئے کہ جب ترافا ان کا سنا پیچوان کادم بند ہوا۔ برسات کے موسم میں شہر کا یہ عالم ہے اِدھر مینہہ برسا پانی جا بجا بہ گیا۔ گلی کوچہ صاف رہ گیا۔ ساون بھادوں میں زر دوزی جوتہ پہنکر پھرے کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے۔ باغ و بہار کی صفت پر درگار کی رضوان جن کا شائق دیکھنے کے لائق روز عیش باغ میں تماشے کا میلہ ہر وقت چین کا جلسہ۔ موتی جھیل کا پانی چشمۂ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا۔ پیاسوں کا دل لہراتا سڑک کے درختوں کی فضا جدھا کھجوا موجیں مارتا ہوا ہارسنگار کے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا باغ میں کوئل پپیہے مور کا شور، جھولے پر گھٹا کالی گھنگھور۔ ساون بھادوں کے جھالے وہ رنگین جھولنے والے دشت غربت میں یہ جلسہ جو یاد آجاتا ہے دل پاش پاش ہوتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ نہ کہ کان پور کی برسات ہیہات ہیہات دخل کیا دروازے سے باہر قدم دھرے اِدھر پھسل نہ پڑے گلی میں پاؤں رکھا کیچڑ کا چھپکا سر پر پہنچا۔ دو اس فصل میں باہم نہ دیکھے گر چلے کہ پھنسے اور جنہیں سواری کا مقدور نہیں دخل کیا جو وہ جائیں کہیں۔ ان کے حق

---

[1] حقہ بنانے والا

میں برسات حوالات، گھر جیل خانہ کہیں آنا نہ جانا۔ اگر خواب میں کہیں نکل گئے تو چونک پڑے کہ پھسل گئے۔ اور جو بازاری کار باری ہیں ان کا یہ نقشہ دیکھا ہاتھ میں جوتیاں پائینچا چڑھا۔ کیچڑ میں لت پت یہاں گرے وہاں گرے خدا خدا کر جیسے گھر پھرے اور جو شیخی کے مارے ننگے پاؤں نہ نکلے تو ۔

دیکھی ہے یہ رسم اس نگر میں
جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں

پھر بر سر مطلب آیا خاص بازار شہر وسیع و خوش قطع ہے۔ اس کے نقشے مانی و بہزاد نے خار کھایا ہے۔ شبیہہ کشی تو کیا خاکہ نہ کھینچا۔ ہاتھ تھرایا ہے۔ کوٹھیاں فرح بخش و دل کشا، برج ہر ایک جہاں نما سلطان منزل اور استری سبحن نشاط افزا تو بہ شکن انسان کو دیکھ کر سکتہ ہو جائے کام ان کا وہم و قیاس میں نہ آئے سر راہ کی بارہ دری جواہر سے جڑی پڑی کی صورت، قریب نہر جاری، تکلف کی تیاری پائیں باغ اس کا جس نے دیکھا باغِ ارم سمجھا۔ سوسن نمط ہزار زبانیں پہنچیں تعریف نہ کر سکا۔ گونگے کا سپنا ہوا رومی دروازہ اس رفعت و شان کا ہے گذرگاہ ایک جہان کا ہے اگر اس پر چڑھ جائیے بام فلک پست معلوم ہو۔ فرشتوں کا مشورہ کان میں آئے۔ سپہر اوّلیں

اس کی زمین ہے بہشت جہت میں دوسرا نہیں ہے۔ مسجد انتخاب ہے۔ امام باڑہ لاجواب ہے۔ مقبرہ عالی شان و نادر مکان کہ فلک بہ دیدۂ انجم نگراں ہے۔ ان کی نظیر کی جستجو میں مشعل مہ و خورشید روز و شب روشن کئے کو بکو سرگرداں ہے۔ اگر پاؤں پھیلانے کی جگہ ان میں ہاتھ آئے سردست مرجانے کو جی چاہے۔ گومتی کے انداز سے نہر کی کیفیت نظر آتی ہے۔ طبیعت لہراتی ہے۔ دو رویہ آبادی عمارت کہیں رمنے کسی جا باغ ہے صبح و شام وہ بہار نظر آتی ہے کہ شام اودھ اور بنارس کی سحر بھول جاتی ہے۔ شہر نفیس مجمع رئیس، ہر فن کا کامل یہاں حاصل ہے۔ خوشنویس حافظ ابراہیم صاحب سا اس قطع کا قطعہ لکھا جو میر علی یا آغا جیتے ہوتے اپنے لکھے کو روتے۔ اشک حسرت سے وصلیاں دھوتے مرزائی صاحب کا یہ حال تھا کوئی پرچہ ان کا ان کی نظر پڑ جاتا بریزہ بریز کہتا۔ یاقوت رقم ہیرا کھاتا۔ مرثیہ خواں میر علی صاحب نے وہ وہ طرز نو مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخ کہن نے مسلم الثبوت استاد کیا۔ علم موسیقی میں یہ کمال بہم پہنچایا اس طرح کا دھرپت خیال ٹپہ گایا اور بنایا کہ کبھی کسی کے وہم و خیال میں نہ آیا تھا۔ ایک رنگین احاطہ کھینچا ہے جو اس میں آیا پھولا پھلا۔ وہ ان کا پیرو ہوا اور جس نے ڈھنگ جدا کیا وہ ٹکسال باہر بدرنگ ہوا۔ اگر

تان سین جیتا ہوتا ان کے نام پر کان پکڑتا۔ بھیک مانگ کر کھاتا مگر نہ گاتا۔ امیروں میں حسین علی خاں بلبل ہزار داستاں، خوش الحان، مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر صاف باطن، نیک ضمیر، خلیق فصیح مرد مسکین۔ مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب، سکندر طالع بصورت گدا بارِ احسان اہل دول کا نہ اُٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیہ سلام دیوان کثیر فرمایا۔

طبیب ہر ایک مسیحائی کرتا ہے۔ قُم باذنی کا دم بھرتا ہے۔ جسے دیکھا بقراط۔ سقراط، جالینوس زماں ہے۔ اس معنی میں یہ خطہ رشکِ زمینِ یونان ہے مبرک جان صاحب پٹرنے کے فن سے ایسے آشنا ہوئے کہ مردم برو بحر سرگرم ثنا ہوئے شاعر زبان داں ایسے کہ عرفی اور خاقانی کی غلطی بتائی فردوسی و انوری کی یاد بھلائی شیخ امام بخش ناسخ نے ہندی کی چندی کی اور روز مرہ کو ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلام سابقین منسوخ ہوا۔ فصحائے شیراز و اصفہان اس سیف زباں کا لوہا مان گئے۔ اپنے قبح پر منفعل ہوئے اس زبان کا حُسن جان گئے۔ زمینِ شعر کو آسمان پر پہنچایا۔ سیکڑوں کو اُستاد بنایا۔ خواجہ حیدر علی کی آتش بیانی، شرر افشانی سے دل جلوں کے سینے میں سوز و گداز ہے۔ مرد قانع شاعر ممتاز ہے۔ فرنگی محل کا

حال کیا لکھوں۔ کہاں زبان و دست کو یارا جو شمہ لکھتا مولوی فاضل عدیم المثال، ہر شخص جمیع علوم کا استاد۔ کتب درسی ابتدا سے انتہا تک یاد۔ منقول و معقول میں دقیقہ باقی نہ رہا۔ ریاضی کے ریاض سے آسمان کو زمین کر دیا۔ مولوی انوار کا پر تو فیض جہاں ہیں۔ روشن مولوی مبین دور بین سراج انجمن مولوی ظہور اللہ سبحان اللہ ایسے محقق کہاں ہوتے ہیں۔ یہی لوگ نادر الزماں ہوتے ہیں۔ ادھر رکن دین بلا کد میر سید محمد مجتہد مرزا کاظم علی متقی۔ آخون محمد رضا رضائے خدا کا جویا حامل قرآن ہمہ دان کسی علم میں عاری نہیں روئے زمین پر آقا محمد تبریزی سا قاری نہیں مشائخ فقیروں کے مزار خوب۔ خواب راحت میں آسودہ سالک و مجذوب شاہ مینا شاہ پیر محمد۔ شاہ خیر اللہ ایک سے ایک سبحان اللہ بظاہر مردہ حقیقت میں جیتے ہیں اشیائے لطیف کھاتے پیتے ہیں۔ مولوی عبد الرحمن برگزیدۂ یزدان عالم باعمل درویش کامل خواجہ باسط اور میر نصیر جن کا عدیل نہ نظیر خواجہ حسین و حسن سرکردہ انجمن طبیعت بس کہ مصروف بہ اختصار ہے۔ ایک ایک فقرہ لکھا ہے ورنہ اُن بزرگواروں کی صفت میں کتابیں تحریر کرے تو بجا ہے مگر ؎

کار دنیا کسے تمام نہ کرد
ہرچہ گیرید مختصر گیرید

# رقعاتِ غالب

## (۱) میر مہدی مجروح کے نام

بھائی کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں، دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دلی کہاں، ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵- دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھئے کہاں اُترتے ہیں۔ اور کیونکر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے دربار میں سات سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر۔ دوجانہ پاٹودی۔ لوہارو چار معدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے ان میں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار پاٹودی حاضر، اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئیں تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود، اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی

ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلی ماروں میں، سگ دنیا موسوم بہ اسد تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام وسبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

تم آتے ہو چلے آؤ، جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا۔ حکیم الملک میر اشرف علی کو دعا۔ قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا، یوسفِ ہند افضل علی کو دعا۔

"غالبؔ"

## (۲) جواب مجروحؔ

قبلہ و کعبہ آداب بجالاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں حضرت اتوار نہیں ہوتا نہ ہو۔ پھول والوں کی سیر موقوف ہو گئی۔ بلا سے گدڑی نہیں جمتی چاندنی چوک کی وہ گرمی بازار نہ رہی نہ سہی اللہ تعالےٰ آپ کو سلامت رکھے۔ دلی کی ہستی تو آپ کی ذات پر منحصر ہے۔ جب آپ کو دیکھ لیا سب کو دیکھ لیا۔ اگر غم ہے تو اس کا ہے اور گردشِ روزگار سے

شکوہ ہے تو یہ ہے کہ آپ کی قدم بوسی سے محروم رکھا اور ملاقات ہر روزہ سے مایوس کیا۔ نہ کسی کی صحبت خوش آئے نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہے۔ ہر روز وہی ہنگامے پیش نظر رہتے ہیں اور وہی یاران جلسہ آنکھوں میں پھرتے ہیں۔ اِدھر یوسف مرزا غل مچاتے ہیں، اِدھر سے یار عزیز چلے آتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کے لوگ آئے ہوئے اطراف و جوانب کی خبر کہہ رہے ہیں۔ میر احمد حسین میکش شوخی و ثقاہت میں لبریز گفتگوئے بین بین میں سرگرم کسی کے چھیڑنے کے لئے نئی نئی تمہیدیں اُٹھاتے ہیں، کسی کو صاحب و قبلہ کہہ کے پاس بٹھاتے ہیں کیوں حضرت! وہ بھی کیا زمانہ تھا اور کیا خوب بسر ہوتی تھی۔ ہر روز ہنسنے بولنے کا ہنگامہ یوں نہ کوئی اندیشہ نہ کوئی غم، اب ان مزوں کا یہ بدلہ ہے کہ ہر ایک کی صورت دیکھنے کو ترستے ہیں اور ہر ایک کی جدائی میں بن آئی۔ نہ یہ اُمید کہ پھر ایک جگہ مل بیٹھیں گے۔ نہ یہ توقع کہ پھر اُن صورتوں کو دیکھیں گے۔ اب سیر و تماشے کی آرزو کیسے اور وہ دل و دماغ کجا، ایسا زمانے نے خاک میں ملایا کہ پھر ہنسنے بولنے کی اُمید ہو ؎

تیرے بیخود جو ہیں سو کیا چیتیں　　ایسے ڈوبے کہیں اُچھلتے ہیں

خدا شاہد ہے کہ پہروں اسی فکر میں پڑا رہتا ہوں کہ پھر بھی وہ دن ہوگا کہ ایک جگہ چار ہم صورت اِکٹھے ہوں کہ یہ چند روز حیات کے اگر بفراغت نہیں تو بغم ہی بسر ہوں مگر کوئی صورت معلوم نہیں ہوتی اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اگر کوئی سبب نکالے تو کیا عجب ہے۔ خیر حضرت یہ رونا تو تمام عمر کا ہے اب عرض یہ ہے کہ نواب گورنر آنے والے ہیں کچھ آپ کے مقدمے کی سلسلہ جنبانی ہوئی۔ پنشن ملنے کی صورت نکلی؟ یہ عقدۂ لاینحل کبھی حل ہوگا، یا میری خاطر کی طرح منعقد رہے گا۔ میر اشرف علی اور میر نصیر الدین اپنے اپنے القابوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور تسلیم بصد تعظیم بجا لاتے ہیں۔ سوائے میرن صاحب کے اُنھوں نے اپنے خطاب سے بہت آنکھ بھوں چڑھائی اور کہا کہ جناب مرزا صاحب قبلہ بھی انھیں پرانی تشابیہہ مستعملہ کا استعمال رکھتے ہیں جس کی سیکڑوں نے اپنے دوست آشناؤں کو نسبت دی ہے۔ پھر میری خصوصیت کیا ہے اور اس پر بھی نرا یوسفِ ہند۔ اگر یوسفِ زمانہ یا یوسفِ کشور لکھتے تو بھی مضائقہ نہ تھا۔ فقط

زیادہ حدِّ ادب

فدوی سید مہدی مجروح

# ۴۔ نامۂ غالب

جانِ غالب! تمہارا خط پہنچا، غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے۔ " ہر ایک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے" مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رُتبے کا ہو گیا ہے اے میر مہدی تجھے یہ کہتے شرم نہیں آتی۔

میاں! یہ اہلِ دہلی کی زبان ہے

اہلِ دہلی یا ہندو ہیں، یا اہلِ حرفہ ہیں، یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی تعریف کرتا ہے لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ سنو حسن کی ٹٹی پر ہوا اب کہاں؟ وہ لطف تو اسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ جہت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہر حال می گذرد۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرالق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے

باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا، یہاں تک کہ راجہ گھاٹ دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک ایک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ رام جی داس گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دہلی نہ رہی اور دہلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد! ارے بندۂ خدا اُردو بازار نہ رہا اُردو کہاں؟ دلّی واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار نہ نہر۔ رہے نام اللہ کا۔ الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام، الیگزینڈر ہیڈر لی کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا ان کی مصاحبت نہیں ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب کو دعا۔

غالب

# ۴۔ جوابِ مجروح

قبلہ و کعبہ! آداب بجا لاتا ہوں، بھلا حضرت مجھے کیوں شرم آئے اگر شرم آئے تو رجب علی سُرُور کو آئے جس نے وہ لاف و گزاف کیا ہے کہ جیسا لکھنؤ ہے ویسا کوئی شہر ہی نہیں، اُن سے کہا چاہیئے کہ ارے مردِ خدا! خدا سے ڈر، لکھنؤ کس بادشاہ کا دارالخلافہ رہا ہے۔ کون سی تاریخ میں وہاں کے لوگوں کی خوش بیانی کا حال لکھا ہوا ہے۔ ماہیت تو اس کی یہی ہے نا کہ مضافات صوبہ اودھ میں کا ایک شہر ہے۔ یہ دلّی سے کیوں کر مقابلہ کرے گا کہ اگر پانسو برس کی تصنیفات دیکھو گے اس میں سے یہی لکھا پاؤ گے ؎

حضرتِ دہلی کنف عدل داد
جنّتِ عدن است کہ آباد باد

اس پر یہ غرّہ کہ جو یہاں کی زبان ہے وہ کہیں کی نہیں باوجودیکہ تفاخراً یہ شعر ناسخؔ نے لکھا ہے ؎

سُن چکے ہیں خوب اُردوے معلیٰ کی زبان
سالہا صحبت رہی ہے ہم کو ناسخؔ میرؔ سے

اور یہ بات ظاہر ہے کہ میرؔ دلّی کے تھے۔ مگر افسوس

کہ اُن کے پیرو اس بات پر خیال نہیں کرتے۔ اے حضرت میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ آپ کو وہاں کی کونسی ایسی بات پسند آئی کہ ایسی طرف داری فرمائی۔ قطع نظر زبان سے، تراش و خراشِ لباس بھی وہاں کی نرالی ہے۔ واہ ری دلی تیرے قربان۔ کیا حد اوسط پر سب کا عمل تھا کہ سب چیز افراط و تفریط سے مائل بحدّ وسط تھی۔ کیوں نہ ہو "خیر الامور اوسطہا" پر سب کا عمل تھا۔ بھلا حضرت یہ کیا آپ فرماتے ہیں کہ وہاں سب طرح کے اہل کمال ہوں گے؟ یہاں امیر کے برابر لکھنؤ میں کون سا خوش نویس تھا؟ حضرت غالب کی سی نظم و نثر کس کی؟

امام الدین خاں سا حکیم، مولانا صدر الدین خاں سا عالم، محمد اعظم سا مصوّر، بدر الدین خاں سے مہرکن کہاں ہے؟ دستنبو کی طرح نواب گورنر بہادر نے کس کی تصنیف طلب کی؟ بدر الدین خاں کے مانند ملکہ معظمہ کی مہر کھُدنے لکھنؤ میں کون سے مہرکن کے پاس آئی۔ خانم کے بازار کے وہ کاریگر جنہوں نے انگریزی اسباب بدل ڈالا اور نہ کسی کو معلوم ہوا یہ لوگ کہاں گو دلی اب اُجڑ گئی اور سارا شہر برباد ہو گیا مگر اس شہر سے جسکی تعریف میں پہلے ہی میر حسن صاحب مثنوی میں فرما گئے ہیں۔ بہتر ہی ہے:۔

زبس یہ شہر ہے پہاڑ پہ بسا
کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسماں پر گھر ہوا میں
کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں
سبہ گل سے گلی یوں تر رہے ہے
بغل جس طرح حبشی کی بہے ہے

اگر دلی کی شہریت اور خوش قطعی کی تعریف کر دوں تو ایک کتاب بن جائے۔ خط سمجھ کر موقوف کیا۔

میر مہدی مجروح

## ۵۔ مرزا علاء الدین خاں کے نام

اس خط میں مرزا غالب نے اپنے مختصر سوانح حیات ایک نئے انداز سے بیان کئے ہیں گو پورا خط استعاروں میں ہے لیکن ہر استعارہ اپنی جگہ لطیف اور موزوں ہے

---

جانِ غالب! یاد آتا ہے کہ تمہارے عم نامدار سے سنا ہے کہ لغات وساتیر کی فرہنگ وہاں ہے اگر ہوتی تو کیوں نہ تم بھیجدیتے خیر ؎

آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

تم ثمرِ نورس ہو اس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں

کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشین اس نہال کا رہا ہوں کیونکر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے رہی دید۔ اس کی دو صورتیں ہیں تم دلی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور میں معذور، خود کہتا ہوں گر میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔

سنو! عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے "لمن الملك اليوم[1]" اور پھر آپ جواب دیتا ہے۔ "لِلّٰہِ الواحد القہار[2]" ہرچند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ[3] میں روبکاری[4] کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ ۱۳ برس حوالات[5] میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا ایک بیڑی[6] میرے پانوں میں ڈالدی اور شہر دلی کو زندان مقرر کیا۔ اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر

[1] آج کے دن ملک کس کا ہے [2] اللہ کے واسطے جو کہ بہت قہر کرنیوالا ہے
[3] پیدا ہوا [4] یعنی دنیا میں مثل قیدی کے رہا [5] یعنی شادی ہوئی۔
[6] مراد بیوی سے ہے۔

کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جیلخانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھادیا۔ جب یہ دیکھا کہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی طاقت یک قلم زائل ہو گئی بیحیا ہوں سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویہ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔[۲] بہرتقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔

غالب

---

[۱] اشارہ ان بچوں کی طرف ہے جن کو غالب نے پرورش کیا تھا۔ [۲] یعنی انتقال کر جاؤں۔

# ڈاکٹر سر سید احمد خاں

## خواجہ الطاف حسین حالی کے نام

(مولانا پانی پت کے رہنے والے ہندوستان کے نامور شاعر تھے۔ جو سعدی ہند کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ نے مسدس "مدوجزر اسلام" سرسید احمد خاں ہی کے اشارہ سے لکھا تھا جس کا ذکر مولانا نے مندرجہ ذیل خط میں لکھا ہے ۱۹۱۴ء میں وفات پائی)

جناب مخدوم و مکرم من عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہونچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہولی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دُور از کار سے جو مایۂ ناز شعراء و شاعری ہے بالکل مبرّا ہے۔ کیونکر ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں

ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ، اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اُڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف اُن ہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہئے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔ آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔ نہایت جلد آپ ان جملہ اُمور سے مجھے مطلع فرمائیے۔ یہ بھی لکھئے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب موجود ہیں۔

آپ کے اس خیال کا حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جائے اور رجسٹری کرادی جاوے میں دل سے شکر کرتا ہوں مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور یا ان کے ماتم کا مرثیہ ہے

کسی قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور قوال درگاہوں میں گا دیں۔ حال لانے والے اس بیچ حال پر حال لاویں۔ اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہو گی۔

میں اس کل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپونگا میرے ان استفسار کا جواب جن پر نشان درج کر دیا ہے بہت جلد مرحمت ہو۔ والسلام

خاکسار آپ کا احسان مند تابعدار

سید احمد

شملہ پارک ہوٹل۔ ۱۰ر جون ۱۸۷۹ء

# پنڈت برج نرائن چکبست

## لالہ سری رام کے نام

جناب والا! تسلیم

آپ نیاز مند کے سوانحی حالات دریافت کرتے ہیں۔ حیران ہوں کہ کیا لکھوں اوّل تو میں باضابطہ شاعر ہی نہیں ہوں۔ تخلص کا بھی گنہگار نہیں ہوں۔ چکبست میرا عرف ہے نہ کہ تخلص۔ سولہ سترہ برس سے شعروسخن کا مذاق ضرور ہے لیکن ایک دیوان بھی تیار نہیں ہوا ایسی حالت میں مجھے باضابطہ شاعروں کے زمرے میں داخل کرنا ہی بے کار ہے مگر خیر مجموعہ میں میرا نام آ ہی گیا۔

اب آپ کو زندگی کے حالات لکھوں۔ لکھنؤ وطن ہے۔ اپنے دوستوں کا دل بہلانے کو کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہوں۔ پرانے رنگ کی شاعری یعنی غزل گوئی سے نا آشنا ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ میرا عقیدہ یہ ہے کہ محض نئے خیالات کو توڑ مروڑ کر نظم کر دینا شاعری نہیں ہے۔ میرے خیال کے مطابق خیالات کی تازگی کے ساتھ زبان میں شاعرانہ لطافت اور

الفاظ میں تاثیر کا جوہر ہونا ضروری ہے۔ لیکن میں پھر آپ کو لکھتا ہوں کہ میں قدر دان سخن ہوں۔ سخنور نہیں ہوں جس کا نام شاعری ہے وہ اور چیز ہے جو بہر حال مجھے نصیب نہیں۔

"چکبست"

# شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار

از

## مولوی محمد حسین آزاد

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مورّخوں نے اس کے لانے کی التجا کی مگر وہ سب کو دروازہ پر چھوڑ گیا۔ اور اپنا آپ رہبر ہوا۔ کیونکہ وہ مورّخ تھا۔ رستہ جانتا تھا۔ اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اے اہلِ تصنیف! میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ہماری شمشیر کے عوض جو خدا نے تمہیں قلم تحریر دیا ہے اُسے اظہار واقعیت اور خلائق کی عبرت اور نصیحت کے لئے کام میں لانا چاہئے یا اغراض نفسانی، اور بدزبانی میں؟ تمام مورخ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ یہ کس پر اشارہ ہے؟ اس وقت تیمور نے ابن عرب شاہ کے بلانے کو ایما فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا چنانچہ اس کا نام مصنفوں

کی فہرست سے نکالا گیا۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ آزاد وضع وقطع نعلق کا لباس بر میں خاک ساری کا عمامہ سر پر آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما وصلحی موزخ اور شاعر سرجھکائے اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازہ پر آکر ٹھہرے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی تو کہا معذور رکھو۔ میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے۔ اور فی الحقیقت وہ معذور رکھے جاتے اگر تمام اہل دربار کا شوقِ طلب ان کے انکار پر غالب آتا۔ وہ اندر آئے ایک طلسمات کا شیشۂ مینائی ان کے ہاتھ میں تھا کہ اس میں کسی کو دودھ کسی کو شربت کسی کو شرابِ شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کرسی نشین اُنہیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے فقط اس سرے سے اُس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے وہ حافظ شیراز تھے اور شیشۂ مینائی ان کا دیوان تھا جو فلک مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے کہ دور سے دیکھا۔ بے شمار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا آتا ہے۔ بیچ میں ان کے ایک پیر مرد نورانی صورت جس کی سفید داڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی۔

اور خندہ جبینی نے ایک طرّہ سر پر آویزاں کیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ دوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی اگرچہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے مگر اُنہیں دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے کیونکہ ایسا کون تھا جو شیخ سعدی اور ان کی گلستاں۔ بوستاں کو نہ جانتا تھا۔ انہوں نے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا اس بیچارے کو ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھا۔ لیکن اورکرسی نشین کہ اکثر ان سے واقف تھے اور اکثر اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے۔ وہ ان کے مشتاق معلوم ہوئے باوجود اس کے یہ ہنسے اور اتنا کہکر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے " دنیا دیکھنے کے لئے ہے برتنے کے لئے نہیں "

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا چنانچہ ایک اولوالعزم شخص آیا جس کے چہرے سے خودسری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مارتا تھا۔ اس کے آنے پر تکرار ہوئی، اور مقدمہ یہ تھا کہ اگر علماء کی نہیں تو مورخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیئے ہے بلکہ چغتائی خاندان کے مورخ صاف اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے

اس نے باوجود اس کے ایک کرسی جس پر تیموری تمغہ بھی لگا تھا گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا ھمایوں اسے دیکھ کر شرمایا اور سر جھکا لیا۔ مگر پھر تاج شاہی پر انداز کجکلاہی کو بڑھا کر بیٹھا اور کہا کہ "بے حق بے استقلال ہے" اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ "مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن کی اولاد میرے رستے پر قدم بہ قدم چلیں گے اور فخر کریں گے"

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا جس کو انبوہ کثیر ایرانی، تورانی، ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ گا بیچ میں لئے آتا تھا۔ وہ جس وقت آیا تو تمام اہل دربار کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں اور رضامندی عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اس کو مسلمان سمجھتے تھے، ہندو اسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا۔ نصاری اُسے نصاری سمجھتے تھے مگر اس کے تاج پر تمام سنسکرت حروف لکھے تھے۔ اس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی شکایت کر کے بداونی پر خون کا دعوی کیا کہ اس نے میری حیات جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا اور وہ فتحیاب ہوتا اگر چند منصف مصنفوں کے ساتھ ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی۔ سب نے کہا نیت کا پھل ہے۔

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا وہ خود مخمور نشہ میں چور تھا ایک عورت صاحب جمال اُس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی وہ جو کچھ دیکھتا تھا اس کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اُسی کی زبان سے کہتا تھا اُس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اس لئے بدمست بھی نہ ہوتا تھا جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی۔

شاہ جہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا بہت سے مورخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لئے تھے اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے میر عمارت ان عمارتوں کے فوٹوگراف ہاتھ میں لئے تھے جو اس کے نام کے کتابے دکھاتی اور سیکڑوں برس کی راہ تک اس کا نام روشن دکھاتی تھیں اس کے آنے پر رضامندی عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا چند بچوں کو ساتھ لئے آیا کہ اپنی آنکھوں کا اور بچّوں کے خون کا دعویٰ

کرتا تھا۔ یہ شہریار شاہ جہاں کا چھوٹا بھائی تھا اور بچّے اس کے بھتیجے تھے۔ اس وقت وزیر اس کے آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا بدنیتی اور خود غرضی سے نہیں بلکہ خلق خدا کے امن اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہر حال اسے دربار میں جگہ ملی اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلے میں معزز درجہ پر ممتاز ہوا۔

ایک تاجدار آیا کہ جُبّہ اور عمامہ سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا مگر دوسرے ہاتھ میں فرد حساب تھی اس میں غرق اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پرتالتا ہے۔ سب نے دیکھ کر کہا کہ انہیں خانقاہ میں لیجانا چاہیے اس دربار میں اس کا کچھ کام نہیں لیکن ایک ولایتی کہ بظاہر مقطع اور معقول نظر آتا تھا وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر آگے بڑھا اور کہا کہ اے اراکین دربار ہمارے ظل سُبحانی نے اس کمبخت سلطنت کے لئے بھائی سے لے کر باپ تک کا لحاظ نہ کیا اس پر بھی تمہارے اعتراض اسے اس دربار میں جگہ نہ دیں گے۔ یہ لطیفہ اس نے اس مسخرے پن سے ادا کیا کہ سب مسکرائے اور تجویز ہوئی کہ تیموری خاندان کے سب سے اخیر میں انہیں بھی

جگہ دے دو۔ معلوم ہوا کہ وہ **عالمگیر** بادشاہ
اور ساتھ اس کے **نعمت خان عالی** تھا۔
اس کے ساتھ ہی ایک بینڈا جوان دکھنی وضع
جنگ کے ہتھیار لگائے راجگی کے سکے تمغے سے سجا
ہوا آیا اس کی طرف لوگ متوجہ نہ ہوئے بلکہ
عالمگیر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر وہ کرسی کھینچ کر
اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور بولا کہ صاحب ہمت
کو جگہ دو یا نہ دو وہ آپ جگہ پیدا کرلیتا ہے
یہ **سیواجی** تھا جس سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد
قائم ہوئی ہے۔
تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے
کی آواز آئی اور بعد اس کے ایک بادشاہ آیا اسکی
وضع ہندوستانی تھی۔ مصنفوں اور مورخوں میں
سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا البتہ چند اشخاص تھے
کہ کوئی ان میں گوّیا اور کوئی مسخرا نظر آتا تھا۔ یہ
سب گھبرائے ہوئے آتے تھے۔ کیونکہ ایک ولایتی
دلاور ان کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ علم کئے تھا
اس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں
مخمل رومی کی کلاہ تھی۔ جس پر ہندوستان کا تاج
شاہی نصب تھا اور اسپ بخارائی زیر ران تھا
وہ ہندوستانی وضع بادشاہ **محمد شاہ** تھا۔ اُسے

دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو نکالو ان کا یہاں کچھ کام نہیں۔ چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے ولایتی مذکور نادر شاہ تھا جس نے سرحد روم سے بخارا تک فتح کر کے تاج ہندوستان سر پر رکھا تھا۔ اُسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لئے تھا اُنہیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے اٹھے اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے یہ ہندوستانی شاعر تھے چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا اس کے منہ سے رنگارنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اُٹھا ہی لیتا تھا وہ مرزا رفیع سودا تھے۔

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز دردناک دُنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کئے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان

کی تصویر کھینچتے تھے۔ میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے دم میں عالم ذی وقار متقی پرہیزگار دم میں داڑھی چٹ بنگ کا سونٹا کندھے پر جرأت کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اُڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے ناسخ کی گل کاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی اور اکثر جگہ قلم کاری اس کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش زبانی اسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی مومن کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے جرأت کی طرف دیکھتے جاتے تھے ایک پیر مرد دیرینہ سال محمد شاہی دربار کا لباس جامہ پہنے کھڑکی دار پگڑی باندھے، جریب ٹیکے آتے تھے۔ مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے بانکے صاحب ضرور ان کے دست و گریباں ہو جاتے لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا۔ یہ بچا لیتے تھے بڈھے میر امن دہلوی "چار درویش" کے مصنف تھے اور بانکے صاحب مرزا سرور "فسانۂ عجائب" والے تھے ذوق کے آنے پر پسند عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انہوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اُٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالب اگرچہ سب سے پیچھے

تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے بڑی دھوم دھام سے آئے
اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان
گنگ کر دیئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب
واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے
اور بس اتنے میں آواز آئی کہ آزاد کو بلاؤ ساتھ
ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگہ میں بیٹھنا قبول
نہ کرے مگر وہیں سے پھر کوئی بولا کہ اسے جن
لوگوں میں بٹھا دو گے بیٹھ جائیگا اتنے میں چند
اشخاص نے غل مچایا کہ اس کے قلم نے ایک جہان
سے لڑائی باندھ رکھی ہے۔ ہمارے دربار شہرت میں
جگہ نہ دینی چاہیئے۔ اس مقدمہ پر قیل و قال شروع
ہوئی میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرہ سے اُلٹ کر آگے
بڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادی ہمدم یعنی فرشتہ
رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا اور چپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت
نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی میں اس جھگڑے کو بھی
بھول گیا اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کرسی
ملی یا نہ ملی۔ مُردوں سے زندوں میں تو آ گیا۔

(نیرنگ خیال حصۂ اول)

# ایک ڈپٹی کلکٹر اِنگریزوں کی ملاقات کا شاکی

از

## مولوی نذیر احمد صاحب

میرے نسبتی بھائی ڈپٹی ہیں۔ برس دن ہوا رخصت لے کر، اُنہیں دِنوں حج کو گئے اب آج کل میں آنے والے ہیں۔ مزاج کے ہیں تیز کسی حاکم سے اُن کی نہیں بنتی اور برس میں دو بار نہیں، بیچارے ہر برس ضرور بدلتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی آ نکلتے ہیں اور اپنے حالات بیان کرتے ہیں اُن سے میں قیاس کرتا ہوں کہ واقع میں ایک دن بھی مجھ جیسے آدمی کا انگریزی دربار میں گزر ہونا مشکل ہے میں نے اپنے بھائی صاحب سے ایک دن پوچھا تھا کہ کہیے کچھ آپ نے بھی سرمایہ جمع کیا تو کہنے لگے "اجی اللہ اللہ کرو، کیسا سرمایہ، خدا جانے کیسے کیسے کتربیونت[1]

---

[1] توڑ جوڑ

کرتا ہوں کہ قرض نہ لینا پڑے۔ مجھ کو تو آئے دن کی بدلی اُدھیڑے ڈالتی ہے۔ ورنہ خدا کا فضل ہے میری تنخواہ خرچ کو کافی ہے بلکہ کچھ پس انداز ہو رہتا ہے،،

**میں:**۔ حقیقت میں آپ کو برس دن بھی کہیں جم کر رہنا نصیب نہیں ہوتا آخر اس کا سبب کیا ہے اور بھی تو ڈپٹی ہیں۔ قطب از جا نمی جنبد برسوں سے ایک جگہ جمے بیٹھے ہیں،،

**بھائی صاحب:**۔ "خدا جانے صاحب لوگ کیا کمال کرتے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ حکام کو راضی رکھوں۔ مگر کچھ ایسی تقدیر کی گردش ہے کہ خواہی نخواہی ناچاقی ہو ہی جاتی ہے اور بار بار کی بدلی نے مجھے اور بھی بدنام کر رکھا ہے لوگ میرا نام سُن کر پکار اُٹھتے ہیں۔ اجی واہ لڑاکو ڈپٹی کلکٹر،،

**میں:**۔ آپ نے اصلی سبب اب بھی نہ بتایا کہ حکام آپ سے کیوں ناراض رہتے ہیں۔ اگر آپ کو میں سرمایہ دار دیکھتا تو شبہہ کر سکتا کہ آپ رشوت لیتے ہوں گے،،

**بھائی صاحب:**۔ "بات صاف صاف تو یہ ہے کہ میں رشوت نہیں لیتا اور مجھ جیسا تنگ مزاج

آدمی رشوت لے بھی نہیں سکتا۔"

**میں**:۔ میں تو سنتا تھا کہ انگریز رشوت سے بہت چڑتے ہیں اور آپ کے فرمانے سے بالکل اُلٹی بات معلوم ہوتی ہے۔"

بھائی صاحب:۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو کسی مُرتشی انگریز سے معاملہ نہیں پڑا نہ میں نے کبھی کسی انگریز کو رشوت دی نہ کسی سے سنا کہ اُس نے انگریز کو رشوت دی۔ انگریزوں کی بڑی رشوت کیا ہے ڈالی یا دورے میں گئے تو رسد یا ڈاک بٹھانے کی ضرورت ہوئی تو گھوڑا گاڑی یا شکار کو نکلے مانگے کے ہاتھی وغیرہ۔ یا خاص خاص لوگوں سے شاذو نادر تحفہ تحائف۔ سو میں ان چیزوں پر رشوت کا اطلاق نہیں کر سکتا رسد میں تو اکثر نوکروں کی شرارت ہوتی ہے کہ صاحب سے بھی ایک ایک دُو دُو لیتے ہیں اور بیچ میں آپ چٹ کر جاتے اور صاحب کو خبر نہیں دیتے" اور کوئی میم والا صاحب ہو اور میم ہوئی کفایت شعار جُز رس اور اُس کے دھیلے انڈا اور آنے مرغی کے دام کاٹ دیئے اور لکڑی گھاس مفت کہ یہ چیزیں تحصیلدار تھانہ دار دیہات سے ضرور بے قیمت لیتے ہیں، اور ہم کتنے ہی دام کیوں نہ دیں اصل مالکوں کو کوڑی

ملنے والی نہیں۔ تو ہاں اس کا عجب نہیں۔ مگر پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ انگریزوں میں رشوت نہیں چلتی مگر انکے حصے کی بلکہ اس سے بہت ان کے اردلی خدمت گار شاگرد پیشہ، پیشی کے عملے لے مرتے ہیں اور صاحب کی آنکھ کان زبان بلکہ ہم زاد جو کہو یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص میری طرح ان ہمزادوں، یا حرام زادوں کو راضی نہیں رکھ سکتا تو کتنا ہی بڑا عہدہ دار کیوں نہ ہو اختیارات حکومت تنخواہ سب کچھ ہے مگر عزت نہیں اور میں چاہتا ہوں تو انگریزوں کے شاگرد پیشوں کو کچھ خرچ کر کرا کے راضی کر لے سکتا ہوں۔ مگر مجھ کو ان کے نام کی کچھ ایسی چڑ سی آپڑی ہے کہ دوہری دوہری سواریاں رکھتا ہوں خدا کے فضل سے نوکر بھی متعدد ہیں۔ مکان کا کرایہ اخبار کھانا کپڑا۔ میرا سارا خرچ میرے پندار میں اجالا ہے۔ سال میں سیکڑوں روپئے تو ہسپتال مدرسہ اور متفرق چندوں میں نکل جاتے ہوں گے یہ تمام مصارف میں خوش دلی سے کرتا ہوں لیکن ڈالیوں اور شاگرد پیشوں کے انعام میں مجھ سے ایک روپیہ خرچ نہیں کیا جاتا۔ اتنی مدت مجھے نوکری کرتے ہوئی اور چھوٹے بڑے صدہا انگریزوں سے میری معرفت ہے مجھے یاد نہیں کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں

یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو۔ میں انگریزوں سے ملتا ضرور ہوں مگر یہ مجبوری دفع ضرورت کے لئے کہ ایسا نہ ہو مغرور سمجھا جاؤں یا عملوں اور اردلیوں کو جو ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں۔ چغلی کھانے کا موقع ملے مجھ کو بعض ایسے کریم النفس انگریزوں سے بھی واسطہ پڑا ہے۔ جنھوں نے صرف بہ تقاضائے انصاف کارگزاری دیکھ کر مجھ کو فائدے پہنچائے ہیں اور میں اُن کا دل سے ممنون، مگر انگریزوں کے عام برتاؤ سے میرا دل کچھ ایسا کھٹا ہو گیا ہے کہ جنھوں نے مجھ پر احسان کئے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی میں نے اس سے زیادہ راہ و رسم نہیں رکھی کہ جب تک افسری ماتحتی کا تعلق رہا۔ جب وہ بدل گئے یا میں بدل گیا تو بھول کر بھی میں کسی کو عرضی نہیں بھیجتا۔ میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چور ہوں کہ جب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کر لیتا ہوں اور آخر زبردستی ٹھیل کر ڈھکیل کر اپنے تئیں لے جاتا ہوں تو کوٹھی پر جاکر ہمیشہ وہی بے لطفی وہی بے عزتی۔ جاڑا ہو۔ پانی برستا ہو، کڑاکے کی دھوپ ہو لوئیں چلتی ہوں۔ ہندوستانی ڈپٹی نہیں، ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہوا۔ اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑے کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو۔ کلکٹر

کلکٹر جنٹ اسسٹنٹ کی تو بڑی بارگاہیں ہیں اگر یورپئین
ڈپٹی کلکٹر سے بھی ملنے گیا ہے (اور نہ ملے تو رہے کہاں)
تو احاطے کے باہر اُترنا ضرور اور احاطے بھی شیطان
کی آنت کہ ہم جیسے پرانی فیشن کے لوگ کوٹھی تک
پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں اور اگر صاحب کہیں
اس حال میں دیکھ جائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے،
نوکری نذر کر آئے۔ اسی دن رپورٹ ہوئی دھری
ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا گویا ڈپٹی کلکٹر
کو ضرور ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہرکارے کی ایک
چوکی تک پوئی نہیں تو دلکی پیٹی کا بستہ لے کر بھاگ سکے۔
پس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی
ایسا ہی گانٹھ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں
کو پہلے سے چھونیاں کرا دی ہیں تو باورچی خانے یا
اصطبل میں پاؤ گھنٹے یا آدھ گھنٹے کھڑے کھڑے دم
لیا اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگا
تو رومال سے منہ ہاتھ پونچھا۔ ہاتھ سے داڑھی مونچھ
کو سنوارا۔ آہستہ سے عمامہ کو ذرا اور جما لیا۔ چغے کے
دامن سمیٹے اور بڑے مودب مقطع بن کر ہاتھ باندھے
نیچی نظریں کئے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی
طرف بڑھے۔ خدمت گار اور اردلی کے چپراسیوں
نے تو احاطے کے باہر ہی تاڑ لیا تھا۔ کوٹھی کے پاس

آتے دیکھ قصداً اِدھر اُدھر ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹہلے کہ کوئی آدمی نظر آجائے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی، باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے اُٹھانے کی آوازیں چلی آرہی ہیں مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اُتار ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے۔ کرسی نہیں، مونڈھا نہیں۔ فرش نہیں، کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں۔ لوٹ چلیں؟ پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں شرمندگی کو ٹالنے کو وہیں تھوڑی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے میں سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا جی خوش ہوا۔ صاحب کا اور اردلی کے لوگوں کا حال معلوم ہوگا۔ وہ لپک کر ایک دوسرے دروازے کے اندر گھس گیا اور ادھر کو رخ بھی نہ کیا۔ غرض کوئی آدھ گھنٹے اور اس انتظار میں تو ایسا معلوم ہوا کہ دو گھنٹے اسی طرح کھڑے سوکھا کئے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لئے ہوئے نمودار ہوا۔ کیا کریں اپنی غرض کے لئے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے حیا اور عزت کو بالائے طاق۔ آپ منہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا۔ کیوں جمعدار کچھ ملاقات کا ڈھنگ نظر آتا ہے؟ بس اسکو ڈپٹی کلکٹر کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر مگر میں جانتا ہوں

کہ ادب اور ڈر تو خاک بھی نہیں صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوجداری سپرد ہے۔ خدا جانے کب موقع آپڑے چار و ناچار اچٹتا ہوا سلام کر کے جیسے کوئی مکھی اُڑاتا ہے اس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے ملاقات تو شاید ہی ہو لیکن آپ بیٹھئے ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں۔ یہ کہہ کر پھر وہ اندر کو جانے لگا تو آخر نہ رہا گیا اور زبان سے نکلا کہاں بیٹھوں اپنے سر پر؟ تب اُسی نے ایک ٹوٹی ہوئی کُرسی تکیہ اور ایک بازو ندارد گویا بیاہ کی تپائی لاکر ڈال دی تو اس کے بعد سے جب کوئی چپراسی یا خدمت گار باہر آتا تو یہ ہی معلوم ہوتا کہ ابھی صاحب غسل خانے سے نہیں نکلے (الٰہی کیا غسل میت ہے) اب کپڑے بدل رہے ہیں، اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں۔ اب چٹھی لکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کو معلوم ہوا کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سن کر جی ہی تو بیٹھ گیا۔ کہ بس اب کیا خاک ملاقات ہوگی۔ ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں آنا تو پڑے ہی گا۔ دوسرے دن کا کیا بھروسا اتنی محنت کیوں ضایع کی جائے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اور صبر کرو بڑی دیر بعد چپراسی یہ حکم لے کر نکلا کہ سر رشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لئے بلایا ہے۔ اب رہی سہی

اُمید اور بھی گئی گذری ہوئی۔ تب اپنا سا منہ لے کر چپراسی سے یہ کہتے ہوئے اُٹھے کہ خیر میں تو اب جاتا ہوں صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا تب خدا جانے چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا میں دو بار آپ کی اطلاع کر چکا ہوں اب پھر کہے دیتا ہوں خفا ہوں گے تو آپ میری آدھ سیر آٹے کی فکر رکھنا غرض بلائے گئے۔ صاحب کو دیکھا تو پیٹ منہ میں لئے ٹہل رہے ہیں۔ بس معلوم ہو گیا کہ مطلق ملاقات نہیں ہو سکتی سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں۔ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر انکو خبر کروں کہ میں آیا کھڑا ہوں کیا معلوم ہے شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو۔ بلکہ مجھ کو تو اس بات کا بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر پہلے سے ان کو خبر تھی چپراسی نے شاید نہ بھی کہا ہو مگر چاروں طرف آئینوں کے کواڑ ہیں۔ عین سامنے کے دروازے سے آیا۔ درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا۔ بڑی دیر تک برآمدہ میں بیٹھا رہا۔ کیا اتنے عرصہ میں ایک بار بھی ان کی نگاہ نہ پڑی ہوگی؟ خیر، آپ ہی سر اُٹھایا۔ اور ڈپٹی صاحب حاکم بالادست ہو کر جو اتنی آؤ بھگت کرے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل دوسری

طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے کے گھر کرسیوں پر بیٹھنا کون نہیں جانتا لیکن میں تو اپنے سے زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدر الصدوروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں کے روبرو کرسی پر بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا۔ کہنے کو کرسی پر بیٹھا مگر حقیقت میں بید پر چوتڑ ٹیکے ہوں تو جیسی چاہو قسم لو۔ تم خدا کے بندے ہو یقین ماننا بس ڈنڈے پر الگ تھلگ جیسے اڈّے پر گلدم۔ کرسی پر بیٹھنا ہی تھا کہ کمبخت چپراسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا خداوند سررشتہ دار حاضر ہیں۔ صاحب میری طرف دیکھتے جاتے ہیں اور چپراسی سے فرما رہے ہیں "اچّا آنے بولو" یعنی اچھا سررشتہ دار کو کہو کہ چلے آئیں۔ سبحان اللہ سات برس اسسٹنٹ رہے نو برس کے قریب جنٹ اور سولہ برس میں صرف ایک بار ڈیڑھ برس کے لئے فرلو پر ولایت گئے تھے بارہ برس دلی میں رہے اور بھاڑ جھونکا۔ چودہ برس میں حضرت نے اردو میں کمال حاصل کیا ہے "اَچّا آنے بولو" اب میں منتظر ہوں کہ صاحب کچھ پوچھیں تو جواب دوں اور سررشتہ دار مردود آگئے آپ پیچھے بستہ قلمدان لئے ہوئے چپراسی آ ہی گھسا سررشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں تو کیا پوچھتے ہیں "وِل صاحب گرمی

بوٹ،، میں (گردن جھکا کر) ہاں خداوند گرمی کے تو دن ہی ہیں۔ میرے علاقہ میں تو پولیس کی رپورٹ سے اتنا معلوم ہوا کہ لُوسے بھی کئی آدمی مرے صاحب کو یہ جواب دے رہا ہوں اور دل میں کہہ رہا ہوں کہ گرمی کا حال تو معلوم تھا۔ ارے ظالم تجھ کو یہ بھی خدا کا ترس نہ آیا کہ بندۂ خدا جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹی ملی ہے (ناظر اپنی بد ذاتی سے تین برس کے پُرانے خس کی بندھوا دیتا ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان) اور جس کو گھر پر ٹٹی لگانے کا مقدور ہے اور جو واقعی میں گرمی بھر اپنے گھر ٹٹی میں رہتا ہے کتنی دیر سے برآمدہ میں پڑا بھن رہا ہے لاؤ سلام لے کر اس کو آزاد کروں سمجھا تھا کہ آدمیوں کا لُوسے مرنا سُن کر چونک پڑے گا اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی کتنے آدمی مرے؟ کب مرے؟ لُو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں؟ اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے ملاحظہ کو بھی آئی یا نہیں۔ غرض آدمی کا دل بولنے اور بات کرنے کو چاہے تو بہتیرے حیلے ہیں پر صاحب تو کچھ پی سے گئے۔ نہیں معلوم دھیان سے نہیں سنا یا مجھے نہیں دیکھا یا کالے آدمیوں کی مرنے کی پرواہ نہیں کی اب سررشتہ دار ہے کہ بستہ کھول کاغذ پھیلا رہا

ہے اور میری اور صاحب کی یہ تپاک کی ملاقات ہو رہی ہے کہ دونوں چُپ۔ جب سر رشتہ دار کا غذ پھیلا چکا اور لگا صاحب کا منہ تکنے تو صاحب مجھ سے فرماتے ہیں " اپ کچ کہ "، یعنی آپ کو کچھ اور کہنا ہے۔ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ نہیں میں تو صرف سلام کے لئے حاضر ہوا تھا۔ بہت دن ہو گئے تھے جی ملنے کو چاہتا تھا۔ پھر حاضر ہونگا۔ میری اس آخری بات میں اور باتیں ہی ایسی کونسی بہت ہوئی تھیں کہ اس کو آخر کہوں۔ بلکہ دوسری بات ہیں جی ملنے کو چاہتا تھا، بلکہ جھوٹ تھا۔ کس مسخرے کا جی ملنے کو چاہتا تھا اور کس مسخرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے۔ ملاقات کے با مزہ اور بے مزہ ہونے کا معیار وقت ہے۔ دیر تک ملاقات رہی تو جانو خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ ہماری ملاقات کیا خاک با مزہ سمجھی جاتی گی کہ جانا اور اُٹھاؤ چولھے کی طرح بیٹھنا اور گفتگو اور رخصت سب کچھ دو ہی منٹ میں ہو ہوا چکا۔ اپنے حساب سے کون ایسا تیسا ملاقات کرنے گیا تھا۔ خدا گواہ ہے صرف ماتھا پھٹوّل وہ بھی اپنے سر کا چھدّا اُتارنے کے لئے۔ صاحب مجھ سے ایک بات بھی نہ کرتے مگر سر رشتہ دار اور چپراسیوں کو میرا اُلٹے پاؤں لوٹ آنا معلوم نہ ہوتا تو مجھ کو کبھی بھی ٹسکا بہت

نہ تھی مگر میری تفضیح ان لوگوں کی نظروں میں ہوئی جو منصبی عزت میں میرے پاسنگ بھی نہ تھے۔

باہر نکلا تو چپراسیوں اور خدمت گاروں کا غول کا غول برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب نے فراشی سلام کیا۔ الہٰی یہ کیا ہے کہ ایسی لمبی چوڑی تعظیم ہو رہی ہے گھنٹوں برآمدے میں بیٹھا سوکھا کیا۔ ان میں سے کسی کی صورت بھی نظر نہیں پڑی اب یہ حشرات الارض کہاں سے نکل پڑے آہا میں اتنی جانفشانی کے بعد صاحب کو ایک سلام کرنے کا گنہگار ہوں۔ یہ سرکاری پیادے اس کا جرمانہ وصول کرنے کے لئے مجھ پر تعینات ہیں ہر چند کہتا ہوں مکان پر تنخواہ پر دیکھا جائے گا۔ عید قریب ہے اس میں سمجھ لینا۔ پیچھا نہیں چھوڑتے آخر میں نے ذرا ترش رو ہو کر کہا اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ ہوتا تو دینے کا نام دینا کبھی کا دے چکا ہوتا۔ ایسی ہی بے اعتباری ہے تو ایک آدمی میرے ساتھ چلو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک آدمی تیار سا ہوا کہ مجھ سے پہلے کوچ بکس پر بیٹھ لے اتنے میں جمعدار نے پنسل اور کاغذ میرے ہاتھ میں دیا کہ حضور ناظر کو رقعہ لکھ دیں۔ جب جب میں قلم اُٹھاتا تھا بے ادب ہاتھ پکڑ پکڑ لیتے تھے۔ پہلے فرما دیجئے کہ

آپ کیا لکھتے ہیں۔ اسی کشمکش میں بڑھتے بڑھتے میں اپنی بگھی پر جا پہنچا۔ سائیس پٹ کھولے کھڑا تھا۔ لپک کر پائدان پر پاؤں رکھ غڑپ بگھی کے اندر سائیس نے کھٹ سے پٹ بھیڑ دیا گھوڑا تھا کہ آہٹ پاتے ہی چل نکلا۔ میں نے کوچبان سے لے کر کاغذ کے پرزے میں ایک روپیہ رکھ پڑیہ بنا اردلیوں کو دکھا کر نیچے پھینک دیا۔ پھر میں نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا تو ایک چپراسی نے پڑیا اُٹھائی بھی ایک روپیہ دیکھ کر یقیناً بہت بگڑے ہوں گے مگر میں ان کی گالیوں کی زد سے باہر نکل چکا تھا بگھی کے اندر بیٹھ کر میں نے ایک لمبا سانس لیا۔ جیسے کوئی مزدور سر پر سے بھاری بوجھ اتار کر تمام راستہ اسی ملاقات کی اُدھیڑ بن میں طے ہوا بار بار خیال آتا تھا کہ سررشتہ دار اور چپراسیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہی اب یہ لوگ تمام شہر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ ایسی بے حرمتی سے روٹی کمانے پر لعنت ہے پھر دل کو سمجھاتا کہ عزّت ایک امر اضافی ہے مجھے اپنے اقران و امثال پر نظر کرنی چاہئے۔ ان کے ساتھ بھی تو اُنیس بیس کے فرق سے ایسی ہی مدارات کی جاتی ہے تو جس مجلس میں یہ سب ننگے ہیں وہاں لنگوٹی کی کیا شرم اسی حیص بیص میں گھر پہنچا چند آدمی منتظر ملاقات تھا

بیٹھے تھے۔ لیکن نہ وہ ڈپٹی تھے نہ میں کلکٹر کہ برآمدے میں محتاجِ اطلاع بیٹھے ہوں۔ آئے تو میں موجود نہ تھا۔ مزے میں گاؤ تکیوں کے سہارے پھیل پھیل کر بیٹھ گئے۔ گھر میں سے پان آ گئے۔ آدمیوں نے حقّے بھر دیئے۔ جوں ہی مجھ کو دیکھا ایک صاحب بولے اللہ اکبر " ڈپٹی صاحب! آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی کون وقتوں سے آپ کا منتظر بیٹھا ہوں" دوسرے صاحب " آج بندے کا ارادہ بھی کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لیگئے ہیں" میں نے کہا بس آج کسی کی دال نہیں گلتی۔ تیسرے صاحب " مدت سے جدید تحصیلداری قائم ہونے کی خبر تھی۔ یہاں تک کہ بورڈ سے منظوری بھی آ چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی انتظام کے صلاح مشورے میں دیر لگی۔ لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں کپڑے اتارتا جارہا ہوں اور اندر ہی اندر دل میں خوش ہوں کہ بھلا ہی خدا کرے لوگ ایسی ہی غلط فہمیوں میں مبتلا رہیں۔

(ابن الوقت)

# دیباچہ مسدّس

از

## مولانا الطاف حسین حالی

### رباعی

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ! تونے ہمکو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

بچپن کا زمانہ جو کہ حقیقت میں دنیا کی بادشاہت کا زمانہ ہے ایک ایسے دلچسپ اور پُر فضا میدان میں گذرا جو کلفت کے گرد و غبار سے بالکل پاک تھا نہ وہاں ریت کے ٹیلے تھے نہ خار دار جھاڑیاں تھیں۔ نہ آندھیوں کے طوفان تھے نہ باد سموم کی لپٹ تھی۔ جب اس میدان سے کھیلتے کودتے آگے بڑھے تو ایک اور صحرا اس سے بھی زیادہ دلفریب نظر آیا جس کے دیکھتے ہی ہزاروں ولولے اور

لاکھوں اُمنگیں خود بخود دل میں پیدا ہو گئیں۔ مگر یہ صحرا جس قدر نشاط انگیز تھا اسی قدر وحشت خیز تھا اس کی سرسبز جھاڑیوں میں ہولناک درندے چھپے ہوئے تھے اور اس کے خوشنما پودوں پر سانپ بچھو لپٹے ہوئے تھے۔ جوہیں اُس کی حد میں قدم رکھا ہر گوشے سے شیر و پلنگ مار و گزدم نکل آئے۔ باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابل دید تھی اگر دنیا کے مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی نہ خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی نہ وصل کی لذت اُٹھائی نہ فراق کا مزا چکھا۔

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں کی وہ خاک اُڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے ربع مسکون کو ہلا ڈالا۔ کبھی چشمِ دریابار سے تمام عالم کو ڈبو دیا آہ و فغاں کے شور سے کرّوبیوں کے کان بہرے ہو گئے شکایتوں کے بوچھار سے زمانہ چیخ اُٹھا۔ طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہو گیا جب رشک کا طلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا یہاں تک کہ اپنے آپ سے بد گمان ہو گئے۔ جب شوق کا

دریا اُمنڈا تو کششِ دل سے جذب مقناطیسی اور قوتِ کہربائی کا کام کیا۔ بارہا تیغِ ابرو سے شہید ہوئے۔ اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اُٹھے گویا زندگی ایک پیرہن تھا جب چاہا اُتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدانِ قیامت میں اکثر گزر ہوا۔ بہشت و دوزخ کی اکثر سیر کی۔ بادہ نوشی پر آئے تو خُم کے خُم لنڈھا دیئے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ کبھی خانہ خمّار کی چوکھٹ پر جبہہ سائی کی اور کبھی مے فروش کے گھر پر گدائی کی۔ کفر سے مانوس رہے ایمان سے بیزار رہے پیرِ مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی برہمنوں کے چیلے بنے بُت پوجے زنّار باندھا۔ قشقہ لگایا۔ زاہدوں پر پھبتیاں کہیں واعظوں کا خاکہ اُڑایا دَیر اور بُت خانہ کی تعظیم کی کعبہ اور مسجد کی توہین کی۔ خدا سے شوخیاں کیں۔ انبیوں سے گستاخیاں کیں۔ اعجازِ مسیحی کو ایک کھیل جانا حسنِ یوسفی کو تماشا سمجھا۔ غزل کہی تو پاک شہیدوں کی بولیاں بولیں قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانوں کے منہ پھیر دیئے ہر مشتِ خاک میں اکثیرِ اعظم کے خواص بتلائے ہر چوب خشک میں عصائے موسوی کے کرشمے دکھائے۔ ہر نمرودِ وقت کو ابراہیم خلیل سے جا ملایا۔ ہر فرعون بے ساماں کو قادرِ مطلق سے جا بھڑایا۔ جس کے مداح بنے اُسے ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوح کو اپنی تعریف

میں کچھ مزا نہ آیا۔ غرض نامۂ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی

چو پرسشِ گنہم روزِ حشر خواہد بود
تمسکاتِ گناہانِ خلق پارہ کنند

بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے۔ اور اپنے نزدیک سارا جہان طے کر چکے۔ جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں۔

شکست رنگِ شباب و ہنوز رعنائی
دراں دیار کہ زادی ہنوز آنجائی

نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں۔ اور خیال کے لئے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا۔ جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین میں محدود رہی ہو اُن سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا۔ اس کے سوا بیس برس کی بیکار اور تنگی گردش میں ہاتھ پاؤں چُور ہو گئے تھے اور طاقتِ رفتار جواب دے چکی تھی۔ لیکن پاؤں میں چکر تھا اس لئے نچلا بیٹھنا بھی دُشوار تھا۔ چند روز

اسی تردد میں یہ حال رہا کہ ایک قدم آگے بڑھتا تھا دوسرا پیچھے ہٹتا تھا۔ ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے ایک دشوار گذار رستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اسکے ساتھ چلے تھے، تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ بہت سے ابھی اسی کے ساتھ افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں۔ پیروں میں چھالے پڑے ہیں۔ دم چڑھ رہا ہے۔ چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں لیکن وہ اولوالعزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے۔ اسی طرح تازہ دم ہے نہ اُسے رستے کی تکان ہے نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پروا ہے۔ نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اس چتون میں غضب کا جادو بھرا ہوا ہے کہ جس طرف آنکھ اُٹھاکر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ اِدھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ اسی دشوار گزار راستے پر پڑ لیے نہ یہ خبر ہے کہ کہاں جاتے ہیں نہ یہ معلوم ہے کہ کیوں جاتے ہیں نہ طلب صادق ہے نہ قلب راسخ ہے نہ عزم ہے نہ استقلال ہے۔ نہ صدق ہے نہ اخلاص ہے۔ مگر ایک زبردست بات ہے کہ کھینچے لیے چلا جاتا ہے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں

دیرینہ سالِ پیرے بردش بیک نگاہے

زمانہ کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے اُبھاروں سے دل بڑھتا تھا نہ ساقیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا۔ مگر یہ ایک ایسے ناسور کا منہ بند کرتا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے بخاراتِ درونی جن کے رکنے سے دم گھٹا جاتا تھا۔ دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے۔ اور کوئی رخنہ ڈھونڈھتے تھے۔ قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور جس طرح خود اپنے پُر زور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اُسی کام میں لگانا چاہتا ہے۔ آ کر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑی شرم کی بات ہے۔ ؎

رو چو انساں لب بجنباں در دہن
در جمادی لافِ انسانی مزن

قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پرواہیں۔ علماء جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصّہ ہے قوم کے بیدار کرنے کے لئے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیال گزرتے رہے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیئے۔ پہلے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے ہیں۔

در فیض است منشیں از کشائش نا اُمید اینجا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

ہر چند اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اُٹھانا دشوار تھا۔ مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دل ہی سے نکلی تھی دل ہی میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا۔ اور باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے اُنہیں سے کام لینا شروع کیا۔ ایک مسدس کی بنیاد ڈالی۔ دُنیا کی مکروہات سے فرصت بہت کم ملی اور بیماروں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہ ہوا۔ مگر ہر حال میں یہ دُھن لگی رہی بارے الحمد للہ کہ بہت سی دقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندے کی بساط کے موافق تیار ہو گئی۔ اور ناصح مشفق سے شرمندہ نہ ہونا پڑا۔ صرف ایک اُمید کے سہارے پر یہ راہ دور دراز طے کی گئی ہے ورنہ منزل کا نشان نہ اب تک ملا ہے نہ آیندہ ملنے کی توقع ہے۔

خبر نیست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

اس مسدس کے آغاز میں سات بند تمہید کے لکھ کر اوّل عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہورِ اسلام

سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں
جاہلیت رکھا گیا پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا
اور نبی اُمّی کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتاً سبز
و شاداب ہوجانا اور اس ابرِ رحمت کا اُمت کی
کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا، اور
مسلمانوں کا دینی و دنیاوی ترقیات میں تمام عالم
پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے بعد ان کے تنزل
کا حال لکھا ہے اور قوم کے لئے اپنے بے ہنر ہاتھوں
سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آکر وہ
اپنے خط و خال کو دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے
اور کیا ہو گئے۔ اگرچہ اس جانکاہ نظم میں جس کی
دشواریاں لکھنے والے کا دل اور دماغ ہی خوب
جانتا ہے۔ بیان کا حق نہ مجھ سے ادا ہوا، اور
نہ ہوسکتا ہے مگر شکر ہے کہ جس قدر ہوگیا اتنی
بھی اُمید نہ تھی۔ ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہرا
اس روکھی پھیکی سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کرینگے
کیونکہ اس میں یا تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں
اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا جو آج کل قوم کی
حالت ہے اس کا صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے نہ کہیں
نازک خیالی ہے نہ رنگین بیانی ہے نہ مبالغہ کی
چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی ہے۔ غرض کوئی بات

ایسی نہیں جس سے اہل وطن کے کان مانوس اور مذاق آشنا ہوں اور کوئی کرشمہ ایسا نہیں کہ لاعینٌ رأت ولا اُذنٌ سمعت ولاخطر علی قلب بشرٍ. گویا اہل دہلی اور لکھنو کی دعوت میں ایک ایسا دستر خوان چنا گیا ہے جس میں اُبالی کھچڑی اور بے مزا سالن کے سوا کچھ بھی نہیں مگر اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لئے نہیں کی گئی ہے بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لئے کی گئی ہے اگر دیکھیں اور پڑھیں اور سمجھیں تو اُن کا احسان ہے ورنہ شکایت نہیں ؎

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس
در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

(دیباچہ مسدس)

# زبان گویا

از

## مولانا الطاف حسین حالی

اے میری بُلبُل ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا، تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جُدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رَد نہ جادو کا اُتار کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنیٰ کھیل ہے جس کے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا، روٹھے کو منانا، اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بِس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور حنظل، کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے سیکڑوں نقصان اور ہزاروں فائدے ہماری عزت، ہماری ذلت ہماری نیکنامی ہماری بدنامی ہمارا سچ، ہمارا جھوٹ صرف تیری ایک "ہاں" اور ایک "نہیں" پر موقوف ہے تیری اس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کے سر کٹوائے۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں مگر تیری طاقت نمونۂ قدرتِ الٰہی ہے دیکھ! اس طاقت کو رائگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی

تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور
کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی
دیکھ! دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے
پیغام پر حاشیے نہ چڑھا

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے۔ اور
تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشف
اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔ علم ایک
خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اسکا
قفل ہے اور تو اس کی کنجی ہے۔ دیکھ! اس قفل کو
بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اُٹھا
وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام
ناصح مشفق تیری صفت ہے اور مرشد برحق تیرا نام۔
خبردار اس نام کو عیب نہ لگا۔ اور اس فرض سے جی
نہ چرا ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائے گا اور
تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائے گا
کیا تجھ کو یہ اُمید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان
بھی اُٹھائے؟ تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے
تو فریب بھی کرے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی
زبان کی زبان کہلائے؟ نہیں ہرگز نہیں!! اگر تو سچی
زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبوں ہے بلکہ سراسر زیاں
ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو تو شہدِ فائق ہے ورنہ تھوک

دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدّی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجا لائے انہوں نے سخت الزام اُٹھائے اور وہ بہت پچھتائے۔ کسی نے انہیں فریبی اور مکّار کہا کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ ان کا نام رکھا۔ کسی نے غماز غیبت اور بہتان مکر اور افترا طعن اور تشنیع، گالی اور دشنام پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی۔ غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکلے اور وہ ان سب کے سزاوار ٹھہرے۔

اے زبان! یاد رکھ ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھیلیں گے۔ پھر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے اور کتّا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے سبحان اللہ وہ نام کے جانور اور اُن کا ظاہر و باطن یکساں ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں "نہیں" اور

زبان پر "ہاں"

الٰہی! اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے تو زبانِ راست گفتار دے اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دُنیا میں رہیں سچے کہلائیں۔ اور جب تیرے دربار میں آئیں تو "سچے" بن کر آئیں۔ آمین

(مقالاتِ حالی حصہ اوّل)

# میر انیس کی شاعری کی خصوصیات

از

## شمس العلما مولانا شبلی نعمانی

**فصاحت** علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں، اُن میں تنافر نہ ہو۔ الفاظ ناموس نہ ہوں۔ قواعد صرفی کے خلاف نہ ہو اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے اور چونکہ آوازیں شیریں، دل آویز اور لطیف ہوتی ہیں مثلاً طوطی اور بلبل کی آواز اور بعض مکروہ اور ناگوار مثلاً کوّے اور گدھے کی آواز اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض شستہ سُبک و شیریں اور بعض ثقیل اور بھدّے ناگوار۔ پہلی قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں اور دوسری کو غیر فصیح۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ فی نفسہ ثقیل و مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں اِن کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ یا بہت کم ہوا ہے۔ اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداً استعمال

کیئے جاتے ہیں تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں اور اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں مخل انداز خیال کیئے جاتے ہیں۔

میر انیس کی کمال شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انہوں نے اردو شعراء میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اور سیکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے ہر قسم اور ہر درجہ کے الفاظ استعمال کرنے پڑے تاہم ان کے تمام کلام میں غیر فصیح الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔ اکثر جگہ عربی فارسی کے الفاظ جو اردو میں کم مستعمل ہیں ضرورت سے لائے پڑتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے الفاظ جہاں آئے ہیں فارسی ترکیبوں کے ساتھ آئے ہیں جس سے اُن کی غرابت کم ہو گئی ہے۔ ورنہ اگر اردو کی خاص ترکیب میں ان الفاظ کا استعمال کیا جاتا تو بالکل خلاف فصاحت ہوتا۔ مثلاً انگشتری۔ خاتم۔ رُخ۔ بادہ۔ ثنا حُسن اور اِس قسم کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ ہیں جو بجائے خود فصیح ہیں۔ لیکن ٹھیٹھ اُردو میں ان کا استعمال نہیں ہوتا۔

میر ضمیرؔ ایک موقع پر کہتے ہیں ع

"ذُرّیتِ رسول کی خاطر جلائی نار"

نار کا لفظ اس موقع پر نہایت نامانوس اور بیگانہ ہے

لیکن یہی لفظ فارسی ترکیبوں کے ساتھ اردو میں منتقل ہوتا ہے۔ مثلاً نارِ دوزخ۔ نارِ جہنم تو وہ غرابت نہیں رہتی۔ فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے۔ بعض الفاظ فصیح ہیں بعض فصیح تر اور بعض اس سے بھی فصیح تر۔

میرانیسؔ صاحب کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے ہم مضمون اشعار لو۔ اگر مرزا صاحب کے یہاں غریب و ثقیل الفاظ ہوں گے تو ان کے مقابلے میں میر صاحب کے یہاں فصیح تر ہوں گے مرزا دبیر کی تخصیص نہیں۔ تمام مرثیہ گویوں کے مقابلہ میں میرانیس صاحب کے کلام کا یہی حال ہے۔ ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلاف مراتب کا اندازہ ہو سکے گا۔

| | |
|---|---|
| مرزا دبیر | "کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں" |
| میرانیس | "سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں" |
| مرزا دبیر | "آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو" |
| میرانیس | "آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو" |
| مرزا دبیر | "رویا میں بھی حسین کو رویا ہی کرتے ہیں" |
| میرانیس | "حسرت یہ ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجئے" |
| مرزا دبیر | "جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحب مکان" |

میر انیس "جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے"

**ابتذال** فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ، آسان، اور کثیر الاستعمال ہو اس لئے لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے۔

مرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں، اکثر ان کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں مثلاً حضرت شہربانو کی زبان سے فرماتے ہیں ع

"ہے ہے مرے دیور مرے دیور مرے دیور"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ع

"ناڑہ تو اس کی سال گرہ کا نکال لا"

ابتذال کی صاف اور بین مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے اگر یہ مبتذل نہ ہوتا تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی میر سے ٹکر کھاتا

ابتذال کے معنے عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں وہ مبتذل ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا ابتذال کا معیار مذاق صحیح کے سوا کوئی چیز نہیں۔ مذاق صحیح

خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل اور لپست اور سوقیانہ ہے

**کلام کی فصاحت** یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی لیکن کلام فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے اُن کی ساخت، ہیئت نشست اور ہلکی و گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب و توازن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ میر انیس کا مصرعہ ہے:۔

"فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور"

صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں اور دونوں فصیح ہیں میر انیس نے جا بجا ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن اگر اس مصرع میں صحرا کی بجائے جنگل کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔

میر صاحب کا ایک شعر ہے۔

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہاں جنگل کی بجائے صحرا لاؤ تو مصرعہ پھُس پھُسا ہو جاتا ہے۔ شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر درجے کے فصیح ہیں، لیکن میر صاحب کے اس شعر میں ؎

"کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کی بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی۔ لیکن یہی لفظ جو اس موقع پر اسقدر فصیح ہے اس مصرع میں ع

"شبنم نے بھر دیئے ننھے کٹورے گلاب کے"

شبنم کے بجائے اوس لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے اس لئے یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کے سلسلے میں وہ ترکیب دیا جائے اُن آوازوں سے اس کو خاص تناسب بھی ہو۔ ورنہ گویا دو مخالف سروں کو ترکیب دینا ہو گا۔ نغمہ راگ اور مفرد آوازوں یا سروں کا نام ہے۔ ہر سُر بجائے خود دل کش و دل آویز ہے۔ لیکن اگر دو مخالف سروں کو باہم ترتیب دیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے۔ راگ کے دل کش اور مؤثر ہونے کا گر یہی ہے کہ جن سروں سے اس کی ترکیب ہو اُن میں نہایت تناسب و توازن ہو۔ الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صوت اور سُر ہیں اس لئے ان کی لطافت شیرینی اور روانی اُسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک گرد و پیش کے الفاظ بھی کے ہیں اُن کے مناسب ہوں۔

مرزا دبیر صاحب کا مشہور مصرع ہے:۔

"زیرِ قدمِ والدہ فردوس بریں ہے"

اس میں جتنے الفاظ ہیں یعنی "زیرِ قدم، والدہ، فردوسِ بریں" سب بجائے خود فصیح ہیں۔ لیکن ان کے باہم ترتیب دینے سے جو مصرعہ پیدا ہوتا ہے وہ اسقدر بھدا اور گراں ہے کہ زبان اس کا تحمل نہیں کر سکتی۔ شاید تم کو خیال ہو کہ مصرعے کی ترکیب چونکہ فارسی ہو گئی ہے۔ اس لئے ثقل پیدا ہو گیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں سیکڑوں شعروں میں اس قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا۔ مثلاً میر انیس صاحب کہتے ہیں

"میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں

میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمد کا مکیں"

پہلے مصرعہ میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالی اضافات بھی موجود ہیں لیکن بھدا پن اور ثقل نہیں ہے۔

جب کسی مصرعہ یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب، توازن، توافق پایا جاتا ہے اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرعہ یا شعر فصیح کہلاتا ہے اور یہ ہی چیز ہے جس کو بندش کی صفائی، نشست کی خوبی، ترکیب کی دل آویزی۔ برجستگی۔ سلاست اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ الفاظ کے توازن اور تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے وہ ایک خاص مثال میں

آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ میر انیس حضرت علی اکبر کے اذان دینے کی تعریف میں ایک موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

"تھا بلبل حق گو، کہ چہکتا تھا چمن میں"

اس مضمون کو میر صاحب دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں ع

"بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسول میں"

وہی مضمون ہے وہی الفاظ ہیں لیکن ترکیب کی ساخت نے دونوں شعروں میں کس قدر فرق پیدا کر دیا۔

میر انیس کا تمام کلام اس خوبی سے معمور ہے اور ان کا ہر شعر اس وصف کا مصداق ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں:۔

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں
قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّہ کی چمک مہر منور سے ملا دوں
کانٹوں کی نزاکت میں گل تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

---

تھا فوجِ قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر
نجیں موج کی طرح سے ادھر کی صفیں ادھر

چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور
پانی میں تھے نہنگ اُبھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

---

چھایا تھا سب پہ رعبِ علم دار نوجواں
تسلیم کو جھکے ہوئے تھے فوج کے نشاں
گوشہ اماں کا ڈھونڈھ رہی تھی ہر اک کماں
ترکش بھی تھے ہراس سے کھولے ہوئے زباں
تیروں کا بے گماں تھا ارادہ گریز کا
منہ کند ہو گیا تھا ہر اک تیغ تیز کا

## کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا

ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے وہ بحال خود قائم رہے مثلاً فاعل مفعول مبتدا خبر، متعلقاتِ فعل جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں یہی شعر میں بھی قائم رہے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ شعر میں اس ترتیب کا بعینہ قائم رہنا قریب ناممکن ہے صرف ایک آدھ شعر یا بہت سے بہت شعر دو شعر میں اتفاقیہ یہ بات پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ نظم کا درحقیقت سبب

سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے۔ اس بنا پر شاعر کو کوشش کرنی چاہیے کہ اگر اصل ترتیب پوری پوری قائم نہیں رہ سکتی تو بہر حال اس کے قریب پہنچ جائے جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا اسی قدر شعر زیادہ صاف برجستہ رواں اور ڈھلا ہوا ہوگا اور اردو میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ صفت میر انیس صاحب سے زیادہ کسی کلام میں نہیں پائی جاتی۔

**روزمرہ اور محاورہ** جو الفاظ اور جو ترکیبیں اہل زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتی ہیں ان کو روزمرہ کہتے ہیں روزمرہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ فصاحت ہی کا ایک فرد خاص ہے یہ ظاہر ہے کہ عام بول چال میں وہی الفاظ زبان پر آئیں گے جو سادہ صاف اور سہل الادا ہوں اور ان میں کچھ ثقل اور گرانی بھی ہو تو رات دن کی بول چال اور کثرت استعمال سے وہ منجھ کر صاف ہو جاتے ہیں روزمرہ کے لئے فصیح ہونا لازم ہے۔

میر انیس کے کلام میں نہایت کثرت سے

روز مرہ اور محاورہ کا استعمال پایا جاتا ہے اور اس پر ان کو ناز بھی تھا چنانچہ فرماتے ہیں :۔

مرغانِ خوش الحان چمن بولیں کیا
مر جاتے ہیں سُن کے روز مرہ میرا

**حسن کلام** حسنِ کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کئے جائیں لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف اقسام ہیں۔ مہیب ۔ پر رعب سخت نرم ۔ شیریں ۔ لطیف ۔ اسی طرح الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہیں ۔ بعض نرم ، شیریں اور لطیف ہوتے ہیں بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہے۔ بعض سے غمگینی اور درد ظاہر ہوتا ہے اسی بنا پر غزل میں سادہ شیریں سہل اور لطیف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ۔ قصیدہ میں زور دار اور شاندار الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ۔ اسی طرح رزم و بزم ، مدح ۔ ذم ، فخر و ادّعا ۔ وعظ و پند ہر ایک کے لئے جدا جدا الفاظ ہیں شعرا میں جو اس نکتہ سے آشنا ہیں وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہ ان کے کلام کی تاثیر کا بڑا جوہر ہے لیکن جو اس فرق مراتب سے واقف نہیں یا ہیں ، لیکن خاص رنگ اُن پر چڑھ گیا ہے کہ ہر قسم کے

مضامین میں ایک ہی قسم کے الفاظ ان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں اُن کا کلام ایک خاص رنگ کے بالکل بے اثر ہوتا ہے۔ یہی نکتہ ہے سعدؔی سے رزم اور فردوسی سے بزم نہ نبھ سکی۔

میر انیس صاحب نے رزم بزم فخر ہجو۔ نوحہ سب کچھ لکھا لیکن جہاں جس قسم کا موقع ہوتا اسی قسم کے الفاظ اُن کے قلم سے نکلتے ہیں رزمیہ فخریہ لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں :۔

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

جلال و غیظ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں :۔

کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے
کیا جانے کس نے روک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

دیکھو! ان اشعار میں جو الفاظ آئے ہیں جس طرح اُن کے مفہوم میں غیظ و غضب ہے اسی طرح الفاظ کی صوت و لہجہ سے ہیبت و غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔

# آزاد فرخ نہاد مع خوجی رونق بخش بمبئی ہوئے

از

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی

اُس روز آزاد پاشا نے جہاز کا بندوبست کیا اور چوتھے دن مع دونوں پریوں اور خواجہ صاحب کے جہاز پر سوار ہوئے۔ سوار ہونے کے وقت خوجی نے بآواز بلند گانا شروع کیا۔

ارے ملاح لگا کشتی مرا محبوب جاتا ہے
شتابو کی تمنا میں مجھے دل لیکے آتا ہے
مگر چھوڑا بدیسی ہو کے خواجہ نے گئے لڑنے
شتابو کے لئے جی میرا کل سے تلملاتا ہے
بدلیع سیاں نہ گھبراؤ وہ سہرا لے کے آتا ہے

جو لوگ اُردو سمجھتے تھے وہ ان کی بے تکی ہانک سُن کر

کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ صبح کا سہانا سماں ساحل بحر میدان فراخ، آواز اس قدر گونجی اور خوجی ایسے محظوظ ہوئے کہ دیر تک گردن ہلا ہلا کر گاتے ہی گئے۔ یقین واثق تھا کہ بیجو باولے کی روح شرما گئی ہو گی۔ تان سین گور میں لرزتا ہو گا آزاد نے شہ دے کر اور چنگ پر چڑھایا۔ جوں جوں اُن کی تعریف ہوتی تھی اور اکڑتے جاتے تھے۔

آزاد نے بار بار پرچک دی تو گلا پھاڑ پھاڑ کے چیخنے لگے (شتابو کی تمنا میں مجھے دل سے کے آتا ہے)

اب سنیئے کہ ایک ٹھاکر صاحب جو بغرض تجارت اکثر اوقات سفر بحری کر چکے تھے خوجی کو دیکھ کر سمجھے کہ یہ کوئی بڑے باکمال عارف باللہ ہیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ قدموں پر ٹوپی رکھدی اور کہا سائیں جی دعائے خیر دو۔ خواجہ صاحب اور بھی اکڑ گئے بہت زور سے ہانک لگائی (مگر چھوڑا بدلبی ہو کے خواجہ نے گئے لڑنے۔ شتابو کے لئے جی میرا کل سے تلملاتا ہے) ٹھاکر صاحب کانپ اُٹھے پھر قدم لئے آزاد نے ہنسی کو بہت ضبط کیا اور ٹھاکر سے کہا یہ مجذوب ہیں۔ ذرا سمجھ بوجھ کے ان سے باتیں کرنا۔ ٹھاکر کو اور بھی یقین ہو گیا کہ یہ ولی حق آگاہ ہیں۔

ٹھاکر:۔ "سائیں صاحب ہمارے حق میں دعائے خیر
دیجئے۔ غلام ہوں"

خوجی:۔ (ٹھاکر کے سر پر ہاتھ پھیر کر) "خوش ہو بابا
فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

ٹھاکر:۔ "آپ کس شہر میں بود و باش کرتے ہیں سائیں
صاحب؟"

خوجی:۔ ع "درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست"
حق حق"

ٹھاکر:۔ (کانپ کر) "اب مجھے اُمید ہے کہ بیڑا پار
ہو جائے گا"

خوجی:۔ بیڑا، یا کردگار! مدد۔ مدد۔ مدد حق حق۔ ؎

دو ہمتم جگر کرد روزی کباب
کہ می گفت گو یندۂ باریاب
دریغا کہ بعدم بسے روزگار
بروید گل و بشگفد لالہ زار
بسے تیر و دے ماہ و اردی بہشت
بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت

اللہ باقی من کل فانی۔ اللہ بس باقی ہوس ؎

چون دی رفت فردا نیاید بدست
حساب از ہمیں یک نفس کن کہ ہست

جہاز کا لنگر کھولا گیا تو خوجی نے بہت زور سے کہا۔
(بیڑا پار۔ ناخدا پار۔ یا خدا بادۂ عرفاں میں سرشار گنہگار شرمسار، یا پاک پروردگار، شتاب جان گل رخسار خواجہ رنگیں بیاں بدیع الزماں سے ہم کنار) جہاز اس طرح رواں ہوا۔

جس طرح سے برق ابرِ شرر بار پہ جائے
جس طرح سے نغمہ کی صدا تار پہ جائے

چند گھنٹوں میں یہ کیفیت ہوئی کہ نیچے سطح آب نظر آتا تھا اوپر چرخِ لاجوردی۔ ادھر اُدھر بحر ناپیدا کنار سر پر فلکِ زرنگار۔ باد نوروزی مشک افشاں و غالیہ ریز روح افزا ہوائے عطر بیز۔ تصور نے یہ رنگ جمایا کہ آزاد کے کان میں کوس ظفر کی صدا آتی تھی اور خوجی کو جو طرفہ فرضی معشوقہ صورت دکھاتی تھی۔ مرکز خاک سے مثلثات افلاک تک عالمِ نور تھا۔ رنج و غم جہازیوں کے دلوں سے اس طرح دور تھا جیسے شرق سے غرب یا نیکی سے بدی۔

اتنے میں ایک ملاح نے کہا لوگو! ہوشیار۔ صاحبو! خبردار۔ آندھی آتی ہے۔ طوفان کی آمد آمد ہے دوسرے ملاح نے کہا۔ گھبراؤ نہیں۔ زور کا طوفان نہیں ہے جلد دور ہو جائے گا۔ اس خبر کے سنتے ہی اکثروں کے ہوش اُڑ گئے اور بیشتر تھرّانے لگے مگر خواجہ صاحب کی بے قراری

سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ غل مچانے لگے۔ ارے دہائی ہے لوگو! دہائی ہے۔ یاراں دہائی ہے۔ دہائی ہے یاراں دہائی ہے غم گساراں۔ جہاز کی دہائی۔ بیڑے کی دہائی۔ سمندر کی دہائی۔ ہائے شتاب جان وائے شتاب جان اری میری پیاری پیاری شتاب دعا مانگ۔

آخری فقرہ کہہ کر ایک مرتبہ اکڑ کر آزاد کی طرف دیکھا۔ آزاد ان کی قبر تک سے واقف تھے تاڑ گئے کہ فقرے کی داد چاہتے ہیں کہا اے سبحان اللہ! شتاب جان کے لئے شتاب کیا خوب ضلع جگت سے تو کہیں چوکتے ہی نہیں کبھی۔

خوجی:۔ تسلیم۔ یہ تو کوئی تعریف نہ ہوئی بندہ نواز۔ ایں جانب اس فن کے نقاد۔ اس علم کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ بھلا کوئی برابری کرے تو بھلا۔

آزاد:۔ اور لطف یہ ہے کہ ایسے نازک وقت میں بھی نہیں چوکتے۔

خوجی:۔ یا خدا میری سن لے۔ میں رکوع و سجود قیام و قعود، صوم و صلوٰۃ روزہ و دعا کا پابند، فقیر کامل و فاضل علامہ باعمل فیلسوف، اور وفاق ہوں۔ مستجاب الدعوات ہوں برگزیدہ کائنات، اشرف المخلوقات ہوں انسان کا انسان حلم ہیں۔ وقت نبرد بشیر مرد، دم صلح

بالکل سرور لے یارو! خدا کو یاد کرو رو رو کر اس کی درگاہ سے دعائے خیر کرو کہ خواجہ بدیع الزّماں بچ جائے اور شتاب جان سے بیاہ ہو اور عمر بھر نباہ ہو۔ خوب روؤ ے

کنونت کہ چشم ست اشکی ببار
زباں در دہانست عذری بیار
نہ پیوستہ باشد رواں در بدن
نہ ہموار گردد زباں در دہن
مکن عمر ضایع بہ افسوس وحیف
کہ فرصت عزیز است والوقت سیف

یا باری تعالیٰ میری مدد کر اور مجھے بچا لے خداوندا۔

راوی۔ اچھی دعا مانگی۔ اور سب چاہے غرقاب ہو جائیں مگر حضور بچ نکلیں۔ شتاب جان کے ساتھ شادی کرنا ہے نا۔

آزاد:۔ خواجہ صاحب یہ کیا سبب ہے کہ آپ صرف اپنے حق میں دعائے خیر مانگتے ہیں اور بچاروں کا بھی تو خیال رکھئے جناب۔

خوجی:۔ میاں! اس میں ایک رلم ہے۔ بندہ مستجاب الدعوات جو دعا مانگوں گا وہ قبول ہو جائے گی۔ اگر سب کے لئے دعا مانگوں تو سب بچ جائیں مگر ایک خرابی ہے کہ اللہ میاں کا ہم پر احسان ہو گا۔ اور ہم

پرائے پھٹے میں کیوں پاؤں ڈالیں۔ فرمائیے ہم پرائے پھٹے میں کیوں پاؤں ڈالیں۔ فرمائیے ہم سے تو نہ ہو سکے گا بندہ پرور۔

اتنے میں آندھی کی آمد آمد ہوئی۔ مس کلیرسا تو میدان رستخیز دیکھے ہوئے تھیں۔ ذرا ہراس یا تشویش نہ کی بلکہ جس رخ سے آندھی اٹھی تھی اس کو دیکھا کیں میڈاگو بانکی وغیرہ تھی سپاہی زادی تھی مگر اس نازک اندام کے دل میں کسی قدر خوف جاگزیں تھا۔ آزاد استقلال کے ساتھ جہاز کے کپتان سے باتیں کر رہے تھے مگر خواجہ صاحب کے ہوش اُڑے ہوئے کہ یا خدا اگر جہاز ڈوبا اور ساتھ ہی خود بدولت بھی غریق لجۂ فنا ہوئے تو شتاب جان کیا کریں گی۔ سب سے زیادہ انہیں کو زندگی عزیز تھی۔ سوچے کہ چاہے مر جائیں مگر اپنا سامان لیس رہے۔ فوراً افیم کی ڈبیا لی اور خوب کس کے کمر میں باندھا اور کہا۔ لو یارو! ہم تو تیار ہیں اب چاہے آندھی آئے چاہے بگولہ چاہے طوفان، بلکہ طوفان کا باپ آئے تو کیا مضایقہ ہے۔ چنیا بیگم کو اب کلیجہ سے لگا لیا بس ع

ہرچہ بادا باد ماکشتی درآب انداختیم

ڈوبیں بھی تو انہیں کے ساتھ ع

ہم تو ڈوبیں گے مگر یار کو لے ڈوبیں گے

تنہائی سے یہاں طبیعت کو نفور ہے۔ اکیلے ڈوبے تو کیا فرمائیے۔ ڈوبیں تو دو ایک کے ساتھ۔

جہاز والے اُن کی عقل پر ہنستے تھے کہ اگر ڈوبنے کا خیال ہے تو افیم کیا بچائے گی۔ ایک ڈبیا میں کھیت کا کھیت لے بیٹھے تو کیا ہوتا ہے۔ بعض آدمی کسی قدر بدحواس تھے اور جو بدحواس نہ تھے وہ بھی کچھ منتشر تھے کہ واللہ طوفان کیا گل کھلائے۔ مگر خواجہ علم صاحب تان لگا رہے تھے کہ

ارے ملاح لگا کشتی مرا محبوب جاتا ہے
شتابی کی تمنا میں مرا دل تلملاتا ہے
بدیع میاں نہ گھبراؤ وہ سہرا جھلکے آتا ہے

بے تکی ہانک سن کر آزاد نے کہا خواجہ صاحب! آپ تو بے وقت کی شہنائی بجاتے ہیں۔ پہلے تو خوب روئے چلائے اور اب تان لگانے اور اُونچ کی لینے لگے ماشاء اللہ کیا عقل ہے یہ گانے کا وقت ہے بھلا۔

الغرض اس مرتبہ کے سفر میں بادِ شرطہ نے ہراس کا موقع نہ دیا۔ ایک مرتبہ طوفان کی آمد آمد تھی فرو ہو گیا۔

خواجہ صاحب ٹھاکر کو راہ میں اُلو بناتے ہوئے مزے سے آتے تھے اور قہقہے پر قہقہے پڑتے جاتے تھے۔ آزاد نے خوجی کے کان میں کہا اُستاد! آتے ہوئے

مس وینشیا یعنی مسز اپلٹن کے سبب سے راستہ کٹا۔اب جاتے ہوئے ٹھاکر کے سبب سے دل بہلے گا۔ ٹھاکر صاحب بار بار خواجہ صاحب عارف باللہ سے مختلف اُمور دریافت کرتے تھے اور میاں ہیں فقیر کامل بنے ہوئے کل اُمور کا اناپ شناپ جواب دیتے تھے۔

ٹھاکر۔ "سائیں جی! جمعہ کے دن سفر کرنا کیسا ہے آپ کے نزدیک؟"

خوجی۔ "سعد۔ جمعہ کو روز آدینہ کہتے ہیں نیک دن ہے"

ٹھاکر۔ "اور جمعرات کے دن کا سفر کیسا ہے؟

خوجی۔ "اچھا، جمعرات سعد اکبر ہے"

ہر گناہ ہے کہ کنی در شب آدینہ بکن
تاکہ از صدر نشینانِ جہنم باشی

آزاد۔ ٹھاکر صاحب! آپ کب سے سفر کر رہے ہیں ہوئے کوئی دس برس؟"

ٹھاکر۔ "ایسا کہ جب سعادت علی خاں تخت نشین ہوئے ہمارا سِن کوئی چودہ برس کا تھا تب سے ہم سفر کرتے ہیں اور ہر سال سفر میں رہتے ہیں۔"

آزاد۔ "تو آپ اودھ کے رہنے والے ہیں مگر اتنا سِن آپ کا نہیں معلوم ہوتا۔ کہ سعادت علی خان کے وقت جلوس آپ چودہ برس کے ہوں۔ چودہ

برس کے سن سے آپ سفر کرتے ہیں اور اب تک ضعیف الاعتقاد بنے رہے،،

ٹھاکر:۔" سینچر کے دن آپ سفر کر کے دیکھ لیں صاحب

خوجی:۔ ان سے اس بارے میں گفتگو ہی نہ کرو۔ یہ ملحد ہیں۔ خدا کو نہیں مانتے ان کا باوا آدم ہی نرالا ہے ؎

از مذہبم ہپرس نہ مومن نہ کافرم
من رسم ایں دیار نہ دانم مسافرم

آزاد:۔" بھلا اودھ آپ نے کب چھوڑا تھا؟ وہاں کی کوئی تازہ خبر بھی معلوم ہے؟ آپ کے اعزہ اقربا کہاں رہتے ہیں؟،،

خوجی:۔"ان باتوں کا پیچھے جواب دینا۔ پہلے ہماری سنو۔ ہر صبح کو بعد مناجات نظامی گنجوی کے یہ اشعار پڑھ لیا کرو ؎

دریغا کہ بگذشت عمر عزیز
بخواہد گزشت ایں دمِ چند نیز
گزشت آنچہ در ناصوابی گزشت
وزیں نیز در بنیابی گزشت
کنوں وقت تخم است اگر پروری
گر امید داری کہ خرمن بری
بشہر قیامت مرد تنگ دست

کہ و جہے نہ دارد بہ حسرت گشت
گرت چشم عقل ست تد بیر گور
اکنوں کن کہ جسمت نہ خوردست مور

ٹھاکر:۔ میں شعر بھی لکھ لوں گا (آزاد کی طرف مخاطب ہوکر) اور وہ پھوڑے ہوئے کوئی تین مہینے کئی روز ہوئے تازہ خبر یہ ہے کہ ایک بیگم صاحبہ نے اپنے عاشق کو حکم دیا کہ اگر شادی کرنا چاہتے ہو تو روم جاؤ اور وہاں اپنے مذہب والوں کی طرف سے خوب لڑو۔ لڑ بھڑ کے جب واپس آؤ گے تمہارے ساتھ نکاح ہو جائے گا۔ لوگ اس کے عاشق کی تو تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معشوق کا حکم پاتے ہی چلا گیا۔ مگر بیگم کی نسبت اکثروں کی رائے ہے کہ عورت اچھی نہیں وہ بیگم شاعرہ بھی ہیں۔ چنانچہ ان کے نام سے ایک غزل مشہور ہے جس کو ارباب نشاط محفلوں اور جلسوں میں اکثر گایا کرتے ہیں،،

آزاد نے آہ سرد بھر کر کہا کہ ٹھاکر صاحب! شاعرہ ہونے میں کچھ فرض نہیں ہے کہ فاحشہ ضرور ہو۔ اکثر عورتیں ہند و مسلمانوں میں ایسی گذری ہیں جو پڑھی لکھی تھیں اور اب بھی اکثر ایسی عورتیں موجود ہیں کوئی تیز طبع ہوئی وہ شعر کہنے لگی۔ اس میں قباحت کیا ہے۔

زیب النسا کیسی عفیفہ و پاک دامن عورت تھی وہ شعر بھی کہتی تھی ؎

ولے برشاعران نادیدہ      غلطی را بخود پسند بدہ
سرو را قد یار می گویند      سر و چوبیست نا تراشیدہ

لکھنؤ کی ایک شاعرۂ آتش زبان کا مطلع سنئے۔

سینے کو چمن بنائیں گے ہم
گل کھائیں گے گل کھلائیں گے ہم

ایک شاعر کا مطلع کس دھوم کا ہے:۔

سر مرا لٹکا کے قاتل نے کہا
پھل لگا ہے آج نخل دار میں

مگر بات یہ ہے کہ آج کل شریف زادیاں تو لکھنے پڑھنے سے بھاگتی ہیں۔ اُن کو شوقِ آرایش و تراش خراش ہے۔ دن بھر بنی ٹھنی رہیں ہردم مانگ چوٹی میں گرفتار پڑھے ان کی بیزار اور بیسواؤں نے اپنی قدر کے لئے لکھنا پڑھنا شروع کیا تاکہ امرا میں اُن کی اور بھی قدر ہو۔ وہ شاعروں میں بیٹھیں بعض بعض خود شعر کہتی ہیں۔ بعض بعض اوروں سے کہوا کر اپنے نام سے مشہور کرتی ہیں۔ اسی سبب سے شریف زادیاں احتراز کرنے لگیں اور اس بیگم بچاری نے جو اپنے عاشق کو روم بھیجا اور شرط کرلی تو کیا گناہ کیا۔ حمیت اسلام اس کی مقتضی تھی۔

ٹھاکر نے کہا۔ ہاں ہماری بھی یہی رائے ہے
مگر بعض آدمی خصوصاً بوڑھے اس کے خلاف ہیں
سنا ہے کہ دو بہنیں ہیں، دونوں پریاں اور وہ جو
روم گئے ہیں ان کا نام آزاد ہے۔ ان کو حسن آرا بیگم
منسوب ہونے والی ہیں۔ ٹھاکر نے بیان کیا حسن آرا
ہزار جان سے آزاد پر عاشق ہیں یہاں تک کہ انکی
شادی کی خبر سُن کر مارے قلق کے زندہ درگور تھیں
آزاد نے پھر (خدا نہ کرے) کہہ کر آہ سرد کھینچی، اور
دل میں سوچے کہ خدا ہی خیر کرے جو آتا ہے ایک تازہ
مصیبت کی خبر سناتا ہے۔

خوجی نے ان کے کان میں کہا، میاں اب وہاں
کا ذکر ہی نہ کرو کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ خدا پر چھوڑ دو
بس اس میں سب قدر ہیں۔ جہاز پر دل بہلا۔ ٹھاکر آ تو
پھنسا ہے اس کو بناؤ۔ بس۔

خوجی:۔ ٹھاکر! سنو بچا۔ ہماری نصیحتیں گوش ہوش سے سنو
ایک تو یہ کہ سفر روز کرو مگر تین بجے سے اُٹھ کے
چار پانچ کوس نکل گئے ورنہ سفر اور خواب میں
بڑا فرق ہے بعد المشرقین۔
دوسری نصیحت یہ ہے کہ بیوی سے زیادہ کے
ساتھ شادی نہ کرنا اور اگر وہ مشیّتِ ایزدی
سے مر جائے تو مجبور ہے زوجۂ ثانیہ کا خیال دل

میں نہ لانا۔
تیسری نصیحت یہ ہے کہ رات کو دو گھنٹے تک ٹھنڈے پانی میں کھڑے رہ کر یاد خدا کرنا اس میں چاہے مرجاؤ مگر منہ نہ موڑنا۔ گرمی سردی برسات تینوں فصلوں میں اِس کا خیال رہے ورنہ پھر پچھتاؤ گے اور یہ اشعار زبان پر لاؤ گے ؎

دریغا کہ فصل جوانی برفت
بہ لہو ولعب زندگانی برفت
دریغا چناں روح پرور زماں
کہ بگذشت برما چو برق تپاں

چوتھی نصیحت یہ ہے کہ عمدہ غذا اور عمدہ پوشاک سے پرہیز کرو۔ کھانے کو جو کی روٹی پینے کو اونٹایا ہوا پانی۔ دستر خوان پر نہ پلاؤ ہو نہ باقر خانی،،
(یہ کہہ کر اکڑ گئے اور آزاد کی طرف غرور کی نظر سے دیکھا)
آزاد نے کہا ہاں واہ شاہ صاحب! پانی اور باقرخانی کا خوب قافیہ ملایا ہے۔ یہ چٹکلے ہیں غذائے لذیذ اور پوشاک نفیس دُنیا پرستوں کے لئے ہے نہ کہ فقرا کے لئے۔

خواجہ صاحب نے آزاد سے دریافت کیا
کہ (جہاز کس وقت بر میمون مقام داخل شوند؟)
آزاد بولے حضرت اب ترکی نہ بولئے۔ اُردو ہی میں
ہم کچھ بچ زبانوں سے باتیں کیجئے۔ یہ میمون مقام چہ
معنی دارد؟
خوجی بہت ہنسے اور یوں سمجھانے لگے برادر!
میمون مقام کا لفظ نہیں سمجھے تو باز چہ خواہی فہمید؟
آزاد نے کہا برادر کے بعد میمون نہ کہا ہوتا۔ دیکھئے ایک
ہولی یاد رکھئے گا۔ اب ہماری زبان سے بھی کوئی
جابے جا کلمہ نکلا تو بُرا نہ مانئے گا۔ خیر خواجہ میمون
مقام کے معنی تو بتاؤ فرمایا میمون مقام مرکب ہے
ساتھ دو لفظوں میمون اور مقام کے میمون کے معنے
بندر (بروزن چقندر) اور مقام کے معنے جگہ۔ جگہ کو
عربی میں گاہ کہتے ہیں۔ میمون پہلے اور مقام اسکے
بعد دونوں پھر مرکّب ہوئے تو ملکر میمون مقام لفظ
قرار پایا یعنی بندرگاہ یعنی وہ جگہ جہاں بندر ہے۔
آزاد:۔ میمون کے معنے بندر سلمنا ہم کو معلوم ہے
مگر بندر کے بعد یہ کہنا کیا فرض تھا کہ
بندر بروزن چقندر۔ خیر۔ اس کو بھی جانے
دو مقام کے معنی کی کیا ضرورت تھی۔ اس
لفظ سے کون واقف نہیں اور پھر جگہ کی

عربی بتانا کیا فرض تھا۔ اور میمونِ مقام کیوں
کہا بندرگاہ ہی کیوں نہ فرما دیا؟"
خوجی:۔ "عام فہم الفاظ ہماری زبان سے نہ نکلیں گے"
آزاد:۔ "کیا بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں آپ؟ سبحان اللہ!"
خوجی:۔ "سبحان اللہ بہ ہمیت۔ کیا کچھ جھوٹ بھی ہے؟
عام فہم الفاظ زبان سے نکلیں تو زبان کاٹ
ڈالوں! پڑھا جن ہوں اور ہماری طبیعت تو
دقّت پسند واقع ہے جب شعر پڑھا ادق،
مغلق ؎

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہیں پر ہمیں منظور نہیں

اِتنے میں ساحلِ بحر نظر آیا تو خواجہ صاحب نے
غل مچایا شتاب جان صاحب! اجی حضور کا
غلام فرزندانہ آداب عرض"
اس قدر کہہ چکے تھے کہ لوگوں نے قہقہہ لگایا
اور خوجی متحیر ہوئے کہ یہ کیا اسرار ہے؟ آزاد سے
پوچھا کہ اس خندۂ بے محل کا کیا سبب ہے؟ آزاد
بولے آپ کی حماقت اس کا سبب ہے۔ گدھا پن
خود کرتے ہو اور اوپر سے ہم سے پوچھتے ہو کہ
اس کا کیا سبب ہے کیا فقرہ کہا تھا آپ نے۔ ذرا
پھر فرمائیے گا۔ خواجہ صاحب نے طیش کھا کر پھر وہی

فقرہ سنایا۔ اجی حضور غلام فرزندانہ آداب عرض کرتا ہے۔

آزاد۔ "آپ شتاب جان کے صاحب زادے فرزند دِل بند ہیں؟"

خوجی۔ "یہ کاہے سے صاحبزادے ہیں یا میاں ہیں۔ شوہر خاص"

آزاد۔ "پھر یہ فرزندانہ آداب کیسا ہوتا ہے۔ جورو کو کوئی فرزندانہ آداب عرض کرتا ہے۔ تو آپ کی بیوی کیا حضرت کی والدۂ شریفہ ٹھہریں؟"

خوجی:۔ (گالوں پر تھپڑ مار کر) ارَرَرَ رَرَ غضب ہوگیا بڑا برا ہوا۔ واللہ ستم ہوگیا۔ سخت مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔ ایسے خفیف ہوئے کہ توبہ بھلی۔ اے ہے خِفّت سی خِفّت ہے مگر چمڑے کی زبان پھسل گئی لیکن تشفی یہ ہے کہ بدحواسی کے وقت ایسا کلمہ زبان سے نکلا اور وہ بھی اپنی پیاری شتاب جان کی نسبت جی۔ پھر دریں چہ مضائقہ باشد۔ اب تو صاف صاف زِفنس نظر آتی ہے وہ دیکھئے ہوا سے زلف درہم برہم ہوئی جاتی ہے۔

اتنے میں جہاز لنگر انداز ہوا اور لوگ اُترنے لگے خواجہ صاحب دور ہی سے فرضی شتاب جان کو

ڈھونڈھنے لگے۔ کرم بخش! او کرم بخش! اب خدا کے
واسطے یہ چونچلے رہنے دے۔

فسانۂ آزاد۔ حصّہ چہارم

# صنعت اور تجارت کے کرشمے

از

## پنڈت رتن ناتھ در سرشار لکھنوی

ایک دن میاں آزاد ہوا خوری کو گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بستی سے کوئی دو گولی کے ٹپے پر ایک جوئبار اور لب چشمہ سار بنگلوں کی قطار ہے۔ اور ہر گلبن پر بلبل رنگیں گفتار ہے۔ غزل خوانان گلشن کی زبان صرف قصیدہ ہائے نوروزی ہر سمت سامان طرب ہے۔ اور اسباب عشرت اندوزی۔ ہر مرغ خوش الحان ترانہ سنج ہے اور مرنجان مرنج سبزہ مثل ساکنانِ خلد سبزہ پوش ہے۔ رند عالم سوز بھی بادۂ وحدانیت کے نشہ میں سرخوش اور مدہوش ہے چہ جماں چہ جماں، اور خراماں خراماں حضرت بھی گلگشتِ چمن کرتے چلے جاتے تھے اور تماشائے نسرین و نسترن سے دل بہلاتے تھے کہ دفعتاً ایک مقام پر پہنچے۔ ملیح سواد ہر کوچہ و برزن آباد چپے چپے رشکِ بہشتِ شداد۔ ذکور چست و چالاک۔ اناث مسرور و فرح ناک، مکانات

فرح بخش و آراستہ، دکانیں بصد قرینہ پیراستہ تنبولی کی
دکان پر شوقین آدمی مصروفِ جاں سپاری ہیں۔
اور ایک عالم مشغول خریداری، اور کیوں نہ ہو سرخرولی[۱]
کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ سبز بخت کا خطاب پایا ہے۔ اِدھر لگا
ہاتھ میں لیا ادھر چاندی کا ورق لگا کر بیڑا دیا۔ کتھا کیوڑے
کا بسا ہوا۔ ایک گلوری کھائے تو غذائے ثقیل ہضم ہو جائے
گمھئی[۲] کا منہ کالا۔ مہوبے گرد کر ڈالا۔ تمباکو والے کی
دِل کش دوکان پر اور ہی آن بان ہے۔ نرالی سج دھج
انوکھی شان ہے جسے دیکھو اسی کا دم بھرتا ہے ناکے پر
بیٹے تو مہنال دروازے تک نڑاقے کی آواز جائے
نیچہ کیا ہزار داستان ہے۔ ہر فصل میں چہک رہا ہے
تمباکو مشک و عنبر کی طرح مہک رہا ہے۔ آتش زبانی
میں فرد۔ دود افگن کی گرم بازاری اس کے مقابلہ میں
سرد پھول ہے۔ سدا بہار یا کوہِ آتشبار۔

گنبد لطافت کا سرطوق چنبر ہے چلم گویا کلاہِ تاج
بر سر ہے۔ چہچہہ زنی پر آمادہ ہوا تو اچھے اچھوں
کے دھوئیں اُڑا دیئے۔ آتش نفسوں کے چھکے چھڑا دیئے
عنبر کی دکان عنبر بار کی طرف جو گزر ہوا تو دماغ طبلۂ
عطار بن گیا۔ خوشبو کیا فتنۂ روزگار ہے کسی کنٹر میں

---

[۱] ایک قسم کا پان ہے [۲] ایک مقام کا نام جہاں کا پان مشہور ہے۔

عطر عروس، کسی میں عرق بہار ہے خراج خطا و ختن،
اس کا مول ہے۔ قنوج۔ اور جون پور اس کی چاہ میں
ڈانواں ڈول ہے۔ مخلخہ و رائحہ سے دماغ معنبر ہے دور
تک شمیم عنبر بیز عطر روح پرور ہے پھر بزاز سے
کی طرف جو نکل گئے تو آب رواں کی جھلک پر خریداری کا
شوق چرّایا روپیہ گاڑھے وقت کام آیا زربفت گلبدنوں
کو بھایا۔ لالہ بنن سکھ سے بھاؤ چکایا۔ انہوں نے دس پانچ
دام بتائے دھوپ چھاؤں کو گرگٹ کے سے رنگ بدل
کر شرمایا۔ حلوائی کا بیٹھا پکوان غضب کا آب و تاب اہم
خرمہ و ہم ثواب۔ برفی دیکھئے تو مُنہ میں پانی بھر آئے
گرسنہ چشم کا جی چاہے کہ تھال کے تھال کھا جائے کتب
فروش کی دکان پر شایقین علم و ہنر کی دھوم ہے شمع
کتب پر اہل قلم کا پروانہ دار ہجوم ہے شعرا کے
تذکرے و دواوین ندرت طراز و مثنوی و کتب اخلاق
طب کے نسخے۔ تاریخ ہیئات اور طبیعات کے رسالے شعرائے
گراں مایہ ایران کا کلام فصاحت التیام علمائے عرب کے
مصنفات عاشق مزاجوں کے مطالبات طرانوں کے ہزلیات
مزاج سمات جدھر نکل جاتے ہیں خوشی کی کھاچیاں
بھری ہیں۔ مسرت کے انبار لگے ہیں بازار نشاط کی
گرم بازاری ہے۔

میاں آزاد دل ہی دل میں سوچتے جاتے ہیں کہ

الٰہی یہ شہر ہے یا خلد بریں یہ زمین ہے یا سواد اعظم عرش تمکین۔ راستے صاف سڑکیں شفاف، کوئی خوشی کے شادیانے بجاتا ہے کوئی رنگ رلیاں مناتا ہے۔ کہیں دنگا نہ فساد۔ ایک شخص کو دوسرے سے رنج نہ عناد چلتے چلتے ایک شخص سے مٹھ بھیڑ ہوئی علیک سلیک کے بعد پوچھا کہ یا حضرت یہ کون گل زمین ہے؟ میں تو اس پر ہزار جان سے قربان ہو گیا۔ یہ سماں دیکھا نہ سنا۔ باشندے سب مرفہ حال۔ سیم و زر سے مالامال بشرے سے خوشی ٹپکتی ہے چہرے سے مسرت برستی ہے میاں یہ شہر تقدس بنیاد میو سواد (چشمش مرساد) چند ہی روز سے آباد ہے لیکن ایسے ساعت سعید اور آدانِ حمید میں اس کی بنیاد پڑی ہے کہ صناعی نے روز بروز ترقی پائی، تجارت نے خوب ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ دستکاری کو دن دونا رات چوگنا فروغ ہوا۔ حضرت یہ سب صنعت و تجارت کے کرشمہ ہیں۔ علم و فضل میں بھی یہاں کے باشندوں نے ید بیضائے ناموری حاصل کیا۔ نثاری میں بے مثل عدیم السہیم، شاعری میں فقید المثال نثر و نثرہ نثار، شعر شعری شعار، الغرض کسی علم، کسی فن، کسی صناعی میں کم نہیں سیم و زر کا لعدم نہیں۔ ہاں ایک بات ضرور ہے۔ نوکری کا کوئی کوئی شائق نہیں، اور نوکری بھی کی تو اعلیٰ فنون کی۔ اسسٹنٹ سرجن ڈیکل آفیسر، انجنیر، اکونٹنٹ، تاجر اور دستکار البتہ

یہاں بکثرت موجود ہیں۔ کشمیر سے شال، ڈھاکے سے ململ مانوے سے افیون، متھرا سے پیڑے۔ لکھنؤ کی کامدانی اور چکن دہلی کی سادے کاری کی انگوٹھیاں، آگرہ کی دریاں کانپور کے منڈے۔ بسواں کا تمباکو اور بمبئی کی اشیائے عزیبہ۔ عرب کے گھوڑے شیفیلڈ کے چاقو، منچسٹر کا کپڑا۔ کابل کے انار۔ بہی سیب۔ کشمیر کا بنفشہ، اجمودِ خراسانی، ساری خدائی کی مشہور چیزیں یہاں آتی ہیں۔ اور دم کے دم میں بک جاتی ہیں ایک ایک دلال نے کوٹھیاں بنالیں لکھ پتی ہو گیا میاں آزاد ایسے خوش ہوئے کہ جامے میں پھولے نہ سمائے۔ واہ ری تجارت تیرے قدم دھو دھو کر پیجئے۔ یہ تیرے ہی دم کا ظہور ہے۔ یہ خدا کے مقبول بندے ہیں۔ یہ نہیں کہ الف بے پڑھی اور منڈا سا باندھ کر کچہری پہنچے۔ یہ بیر ختم کی اور جغہ ڈانٹ کر کلارکی پر اُدھار کھا بیٹھے۔ برسوں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں مگر نوکری ملی یا نہ ملی چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے تو وہ نوکری پر ہی لٹو رہیں گے۔ ہائے افسوس یارو برائے خدا زرا اس شہر کی حالت پر نظر ڈالو نوکری کے پھندے سے چھوٹو۔ یہ چہل پہل یہ رونق یہ کیفیت، یہ لطف تازہ اور سرور بے اندازہ نوکری میں کہاں۔

---

# لکھنؤ کے رکاب دار

از

## مولانا محمد عبدالحلیم شرر لکھنوی

انسانی معاشرت میں سب سے زیادہ ضروری اور سب سے اہم کھانا پینا ہے اور کسی گروہ اور کسی قوم کے ترقی کرتے وقت سب سے پہلے شوق اپنی خوش مذاقی اور جدتوں کا اظہار دستر خوان پر کرتا ہے اسی لئے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ باورچی خانے اور دستر خوان کے متعلق لکھنؤ کے مشرقی دربار نے کیا رنگ دکھایا اور کیا کیا جدت طرازیاں کیں اور اس فن میں یہاں کے لوگوں نے کس درجے تک ترقی کی۔

یہ معمول ہے کہ جو کام جس شخص کے ذریعہ سے ہوتا ہے وہ اس میں کچھ نہ کچھ ترقی ضرور کرتا ہے اور اس کا شوقین بن جاتا ہے۔ چنانچہ لکھنؤ میں کھانے کے ابتدائی شوقین بھی رؤسا تسلیم کئے جاتے تھے۔ اور اسی کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ یوں تو اس سر زمین میں کھانے کے شوقین

صدہا رئیس پیدا ہو گئے۔ مگر نواب سالار جنگ کے خاندان کو آخر تک الوانِ نعمت کی ایجاد و ترقی میں خاص شہرت ہوئی۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ خود نواب سالار جنگ کا باورچی جو صرف ان کے لئے کھانا تیار کیا کرتا تھا۔ بارہ سو روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا جو تنخواہ آج بھی کبھی بڑے سے بڑے ہندوستانی دربار میں کسی باورچی کو نہیں ملتی۔ خاص ان کے لئے وہ ایسا بھاری پلاؤ پکاتا کہ سوا ان کے اور کوئی ہضم نہ کرسکتا۔ یہاں تک کہ ایک دن نواب شجاع الدولہ نے اُن سے کہا "تم نے کبھی ہمیں وہ پلاؤ نہ کھلایا جو خاص اپنے لئے پکوایا کرتے ہو۔" عرض کیا "بہتر ہے آج حاضر کروں گا۔" باورچی سے کہا۔ "جتنا پلاؤ روز پکاتے ہو آج اس کا دونا پکانا" اُس نے کہا "میں تو صرف آپ کے خاصے کے لئے نوکر ہوں کسی اور کے لئے نہیں پکا سکتا۔" کہا "اے نواب صاحب نے فرمائش کی ہے ممکن ہے کہ میں ان کے لئے نہ لیجاؤں۔" اس نے کہا۔ "کوئی ہو میں تو اور کسی کے لئے نہیں پکا سکتا۔" جب سالار جنگ نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے کہا۔ "بہتر مگر شرط یہ ہے کہ حضور خود لے جاکر اپنے سامنے کھلائیں اور چند لقموں سے زیادہ نہ

کھانے دیں اور احتیاطاً آبدار خانے کا انتظام بھی کر کے اپنے ساتھ لے جائیں،،

سالار جنگ نے یہ شرطیں قبول کیں آخر باورچی نے پلاؤ تیار کیا اور سالار جنگ خود لے کے پہنچے، اور دسترخوان پر پیش کیا۔ شجاع الدولہ نے کھاتے ہی تعریف کی اور رغبت کے ساتھ کھانے لگے۔ مگر دو ہی چار لقمے کھائے تھے کہ سالار جنگ نے بڑھ کے ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا "بس اس سے زیادہ نہ کھائیے،، شجاع الدولہ نے حیرت سے ان کی صورت دیکھی اور کہا "اُن چار لقموں میں کیا ہوتا ہے،، اور یہ کہہ کے زبردستی دو ایک لقمے اور کھا ہی لئے۔ اب پیاس کی شدّت ہوئی۔ سالار جنگ نے اپنے آبدار خانے سے جو ساتھ گیا تھا پانی منگوا کے پلانا شروع کیا بڑی دیر کے بعد خدا خدا کر کے تشنگی موقوف ہوئی اور سالار جنگ اپنے گھر آئے۔

آج کل کے مذاق میں یہ غذا کی کوئی خوبی نہیں سمجھی جاتی مگر اس زمانے میں اور پُرانے مذاق کے کھانے والوں کے نزدیک اب بھی غذا کی خوبی کا اصلی معیار یہی ہے کہ غذائیں بظاہر نفیس و لطیف ہوں مگر اصل میں اس قدر قوی اور معدے پر گراں ہوں کہ معدہ ہرگز برداشت نہ کر سکے۔

دوسرا کمال یہ تھا کہ کسی ایک چیز کو مختلف

صورتوں میں دکھا کے ایسا بنا دیا جائے کہ دسترخوان پر ظاہر بیں تو یہ نظر آئے کہ بیسیوں قسم کے الوان نعمت موجود ہیں مگر چکھئے اور غور کیجئے تو وہ سب ایک ہی چیز ہیں۔ مثلاً معتبر ذرایع سے سُنا جاتا ہے کہ دہلی کے شاہزادوں میں سے مرزا آسمان قدر فرزند مرزا خرّم بخت جو لکھنؤ میں آکے شیعہ ہوئے اور چند روز یہاں ٹھہرنے کے بعد بنارس میں جا کے قیام پذیر ہو گئے۔ قیام لکھنؤ کے زمانے میں واجد علی شاہ نے انکی دعوت کی تو دسترخوان پر ایک مرتبہ ایک مُربّہ لاکے رکھا گیا جو صورت میں نہایت ہی نفیس و لطیف اور مرغوب تھا۔ مرزا آسمان قدر نے اس کو کھایا تو چکرائے اس لئے کہ وہ مربّہ نہ تھا بلکہ گوشت کا نمکین قورمہ تھا جس کی صورت رکاب دار نے بعینہ مُربّے کی سی بنا دی تھی یوں دھوکا کھا جانے پر انہیں ندامت ہوئی اور واجد علی شاہ خوش ہوئے کہ دہلی کے ایک معزز شاہزادے کو دھوکا دیدیا۔

دو چار روز کے بعد مرزا آسمان قدر نے واجد علی شاہ کی دعوت کی اور واجد علی شاہ یہ خیال کر کے آئے تھے کہ مجھے ضرور دھوکہ دیا جائے گا مگر اس ہوشیاری پر بھی دھوکا کھا گئے۔ اس لئے کہ آسمان قدر کے باورچی شیخ حسین علی نے یہ کمال کیا

تھا کہ گو دستر خوان پر صدہا الوانِ نعمت اور قسم قسم کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ پلاؤ تھا۔ زردہ تھا۔ بریانی تھی۔ قورمہ تھا۔ کباب تھے۔ ترکاریاں تھیں چٹنیاں تھیں، اچار تھے۔ روٹیاں تھیں۔ پراٹھے تھے۔ شیرمالیں تھیں۔ غرضکہ ہمہ نعمت موجود تھی۔ مگر جس چیز کو چکھا شکر کی بنی ہوئی تھی۔ سالن تھا تو شکر کا۔ چاول تھے تو شکر کے۔ اچار تھا تو شکر کا اور روٹیاں تھیں تو شکر کی۔ یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ تمام برتن دستر خوان اور سلفچی، آفتابہ تک شکر کے تھے۔ واجد علی شاہ گھبرا گھبرا کے ایک ایک چیز پر ہاتھ ڈالتے تھے۔ اور دھو کے پر دھو کے کھا رہے تھے۔

ہمارے ایک دوست نواب محمد شفیع خاں صاحب بہادر نیشاپوری کا بیان ہے کہ ان کے نانا نواب آغا علی حسن خاں صاحب کے گھر سے جو نیشاپوریوں میں سب سے زیادہ نامور اور ممتاز تھے بادشاہ کے لئے روغنی روٹی اور میٹھا گھی جایا کرتا تھا۔ روغنی روٹیاں اس قدر باریک اور نفاست سے پکائی جاتیں کہ موٹے کاغذ سے زیادہ گندہ نہ ہوتیں اور پھر یہ ممکن نہ تھا کہ چتّیاں پڑیں اور نہ یہ مجال تھی کہ کسی جگہ پر کچی رہ جائیں۔ میٹھا گھی بھی ایک خاص چیز تھا۔ جو بڑے اہتمام سے تیار کرایا جاتا تھا۔

دہلی میں بریانی کا زیادہ رواج ہے اور تھا۔ مگر لکھنؤ کی نفاست نے پلاؤ کو اس پر ترجیح دی۔ عوام کی نظر میں دونوں قریب قریب بلکہ ایک ہی ہیں مگر بریانی میں مسالے کی زیادتی سے سالن ملے ہوئے چاولوں کی شان پیدا ہو جاتی ہے اور پلاؤ میں اتنی لطافت نفاست اور صفائی ضروری سمجھی جاتی ہے کہ بریانی اس کے سامنے ملغوبہ سی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معمولی قسم کے پلاؤ سے بریانی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ پلاؤ خشکہ معلوم ہوتا ہے جو عیب بریانی میں نہیں ہوتا۔ مگر اعلیٰ درجے کے پلاؤ کے مقابل بریانی نفاست پسند لوگوں کی نظر میں بہت ہی لدھڑ اور بدنما غذا ہے۔ بس یہی فرق تھا جس نے لکھنؤ میں پلاؤ کو زیادہ مروج بنا دیا۔

پلاؤ یہاں کہنے کو تو سات طرح کے مشہور ہیں اُن میں سے بھی صرف گلزار پلاؤ۔ نور پلاؤ۔ کوکو پلاؤ۔ موتی پلاؤ۔ اور چنبیلی پلاؤ کے نام ہمیں یاد ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہاں کے اعلیٰ درجے کے دستر خوان پر بیسیوں طرح کے پلاؤ ہوا کرتے تھے محمد علی شاہ کے بیٹے مرزا عظیم الشان نے ایک شادی کے موقع پر سمدھی ملاپ کی دعوت کی تھی جس میں خود فرماں روائے وقت واجد علی شاہ بھی شریک تھے اس دعوت میں دستر خوان پر نمکین اور

میٹھے کل ستر قسم کے چاول تھے۔
غازی الدین حیدر بادشاہ کے عہد میں نواب سالار جنگ کے خاندان سے ایک رئیس تھے نواب حسین علی خاں انہیں کھانے کا بڑا شوق تھا خصوصاً پلاؤ کا ان کے دستر خوان پر بیسیوں طرح کے پلاؤ ہوا کرتے اور وہ ایسی نفاست اور لطافت کے ساتھ تیار کئے جاتے کہ شہر بھر میں اُن کی شہرت ہو گئی۔ یہاں تک رؤسا و عمائد میں سے کوئی ان کے مقابلے کی جرأت نہ کر سکتا خود بادشاہ کو اُن پر رشک تھا اور کھانے کے شوقینوں میں وہ چاول والے مشہور ہو گئے تھے۔
نصیر الدین حیدر کے عہد میں باہر کا ایک باورچی آیا جو پستے اور بادام کی کھچڑی پکاتا۔ بادام کے سڈول اور صاف ستھرے چاول بناتا۔ پستے کی دال تیار کرتا اور اس نفاست سے پکاتا کہ معلوم ہوتا نہایت عمدہ نفیس اور پھریری ماش کی کھچڑی ہے مگر کھائیے تو اور ہی لذت تھی اور ایسا ذائقہ جس کا مزہ زبان کو زندگی بھر نہ بھولتا۔
نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں ایک صاحب کمال باورچی صرف چاولوں کی گلتھی پکاتا مگر ایسی گلتھی جو شاہی دستر خوان کی رونق فرمانروائے وقت کو نہایت ہی مرغوب تھی اور شہر کے تمام

رئیسوں کو اس کا ایک لقمہ ملجانے کی تمنا تھی۔
مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ کے سامنے ایک نیا باورچی پیش ہوا پوچھا گیا "کیا پکا تے ہو؟" کہا "صرف ماش کی دال پکاتا ہوں"، پوچھا "تنخواہ کیا لوگے؟ کہا "پانچسو روپیہ" نواب نے نوکر رکھ لیا مگر اس نے کہا "میں چند شرطوں پر نوکری کروں گا" پوچھا "وہ شرطیں کیا ہیں؟ کہا "جب حضور کو میرے ہاتھ کی دال کا شوق ہو ایک روز پہلے سے حکم ہو جائے اور جب اطلاع دوں کہ تیار ہے تو حضور اُسی وقت تناول فرمائیں" نواب نے یہ شرطیں بھی منظور کریں۔
چند ماہ کے بعد اُسے دال پکانے کا حکم ہوا اس نے تیار کی اور نواب کو خبر کی " اچھا دستر خوان بچھاؤ میں آتا ہوں" دستر خوان بچھا مگر نواب باتوں میں لگے رہے اُس نے جا کے پھر اطلاع دی کہ "خاصہ تیار ہے"، نواب کو پھر آنے میں دیر ہوئی۔ اس نے سہ بارہ خبر کی اور اس پر بھی نواب صاحب نہ آئے تو اُس نے دال کی ہانڈی اُٹھا کے ایک سوکھے پیڑ کی جڑ میں انڈیل اور استعفیٰ دے کر چلا گیا۔ نواب کو افسوس ہوا۔ ڈھونڈھوایا مگر اس کا پتہ نہ چلا۔ چند روز بعد دیکھا تو جس درخت کے نیچے دال پھینکی گئی تھی وہ سرسبز ہو گیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اس واقعہ میں مبالغہ ہے جس نے اسے خلاف قیاس ہونے کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ مگر اس سے اتنا اندازہ البتہ ہو جاتا ہے کہ دربار میں باورچیوں کی کس درجہ قدر ہوتی ہے۔ اور کوئی صاحب کمال باورچی آجاتا تو کس فیاضی سے رکھ لیا جاتا۔

امیروں کا یہ ذوق و شوق دیکھ کے باورچیوں نے بھی طرح طرح کی جدت طرازیاں شروع کر دیں۔ کسی نے پلاؤ انار دانہ ایجاد کیا۔ اس میں ہر چاول آدھا یاقوت کی طرح سرخ اور جلادار ہوتا اور آدھا سفید۔ مگر اس میں بھی شیشے کی سی چمک موجود ہوئی جب دستر خوان پر لاکے لگایا جاتا تو معلوم ہوتا کہ پلیٹ میں ابلق رنگ کے جواہرات رکھے ہوئے ہیں۔

ایک باورچی نے نورتن پلاؤ پکا کے پیش کیا جس میں نورتن کے مشہور جواہرات کے مثل نو رنگ کے چاول ملا دیئے اور پھر رنگوں کی صفائی اور آب و تاب عجیب نفاست اور لطف پیدا کر رہی تھی۔ اسی طرح کی خدا جانے کتنی ایجادیں ہو گئیں جو تمام گھروں اور باورچی خانوں میں پھیل گئیں۔

کھانا تیار کرنے والے تین گروہ ہیں پہلے دیگ شو جن کا کام دیگوں کا دھونا اور باورچیوں کی

ماتحتی میں مزدوری کرنا ہے۔ دوسرے باورچی۔ یہ لوگ کھانا پکاتے ہیں اور اکثر بڑی بڑی دیگیں تیار کر کے اُتارتے ہیں۔ تیسرے رکاب دار۔ یہی لوگ اس فن کے اعلیٰ درجے کے ماہر اور صاحبِ کمال ہوتے ہیں۔ یہ لوگ علی العموم چھوٹی ہانڈیاں پکاتے ہیں اور بڑی دیگیں اُتارنا اپنی شان اور مرتبے سے ادنیٰ کام خیال کرتے ہیں اگرچہ اکثر باورچی بھی، چھوٹی ہانڈیاں پکاتے ہیں مگر رکاب داروں کا کام فقط چھوٹی ہانڈیوں تک محدود تھا۔ یہ لوگ میوہ جات کے پھول کترنے کھانا نکالنے اور لگانے میں سلیقہ، نفاست اور تکلف ظاہر کرتے ہیں۔ جو پھول اور قابوں میں جو پلاؤ یا زردہ نکالا جاتا ہے اس پر میوہ جات اور دیگر طریقوں سے گلکاریاں کرتے، نقش و نگار بناتے۔ نہایت نفیس اور لطیف مربّے اور اچار تیار کرتے اور کھانوں میں اپنی طبیعت داری سے صدہا قسم کی صنعتیں دکھاتے۔

غازی الدین حیدر پہلے شاہِ اودھ کو پراٹھے پسند تھے اُن کا رکاب دار ہر روز چھ پراٹھے پکاتا اور فی پراٹھا پانچ سیر کے حساب سے تیس سیر گھی روز لیا کرتا۔ ایک دن وزیرِ سلطنت معتمدالدولہ آغا میر نے شاہی رکاب دار کو بلا کے پوچھا " ارے بھئی

یہ تیس سیر گھی کیا ہوتا ہے؟" کہا۔۔ "پراٹھے پکاتا ہوں" کہا۔۔ بھلا میرے سامنے تو پکاؤ" اس نے کہا "بہت خوب" پراٹھے پکائے جتنا گھی کھپا کھپایا اور باقی بچا پھینک دیا۔ معتمدولہ آغا میر نے دیکھ کے حیرت اور استعجاب سے کہا "پورا گھی تو خرچ نہیں ہوا" اس نے کہا "اب یہ گھی تو بالکل تیل ہو گیا۔ اس قابل تھوڑے ہی ہے کہ کسی اور کھانے میں لگایا جائے"

وزیر سے جواب تو نہ بن پڑا مگر حکم دیا کہ "آیندہ صرف پانچ سیر گھی دیا جایا کرے۔ فی پراٹھا ایک سیر بہت ہے" رکاب دار نے کہا۔ "بہتر۔ میں اتنے ہی گھی میں پکا دیا کروں گا" مگر وزیر کی روک ٹوک سے اس قدر ناراض ہوا کہ معمولی قسم کے پراٹھے پکا کے بادشاہ کے خاصے پر بھیجدیے۔ جب کئی دن یہی حالت رہی تو بادشاہ نے شکایت کی کہ "یہ پراٹھے اب کیسے آتے ہیں؟" رکاب دار نے عرض کیا "حضور جیسے پراٹھے نواب معتمدالدولہ بہادر کا حکم ہے پکاتا ہوں" بادشاہ نے اس سے حقیقت پوچھی تو اس نے سارا حال بیان کر دیا۔ فوراً معتمدالدولہ کی یاد ہوئی۔ انہوں نے عرض کیا "جہاں پناہ یہ لوگ خواہ مخواہ کو

لوٹتے ہیں۔" بادشاہ نے اس کے جواب میں دس پانچ تھپڑ اور گھونسے رسید کئے، خوب ٹھونکا اور کہا "تم نہیں لوٹتے ہو۔ تم جو ساری سلطنت اور سارے ملک کو لوٹے لیتے ہو اس کا خیال نہیں۔ یہ جو تھوڑا سا گھی زیادہ لے لیتا ہے اور وہ بھی میرے خاصے کے لئے۔ یہ تمہیں نہیں گوارا ہے۔"

بہرحال معتمد الدولہ نے توبہ کی کان اینٹھے تو خلعت ہوا۔ جو اس بات کی نشانی تصور کی جاتی ہے کہ آج جہاں پناہ نے دستِ شفقت پھیرا ہے اور اپنے گھر آئے پھر انہوں نے کبھی اس رکابدار سے تعرض نہیں کیا اور وہ اسی طرح تیس سیر گھی روز لیتا رہا۔

آخر زمانہ میں اور غدر کے بعد لکھنؤ میں حکیم بندہ مہدی مرحوم کو کھانے اور پہننے کا بیحد شوق تھا اور بڑے بڑے دولت مند اور شوقین لوگوں کو یقین ہے کہ جیسا کھانا انہوں نے کھایا اور جیسا کپڑا انہوں نے پہنا اس زمانے میں بہت کم کسی کو نصیب ہو سکا۔ ہمارے ایک معمر و معزز دوست فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان سے حکیم صاحب موصوف سے بہت ربط و ضبط تھا۔ ایک دن حکیم صاحب نے ہمارے والد اور چچا کو بلا بھیجا کہ ایک

پہلوان کی دعوت ہے آپ بھی آکر لطف دیکھئے
والد تشریف لے گئے اور میں بھی ان کے ساتھ
گیا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ وہ پہلوان روز صبح کو
بیس سیر دودھ پیتا ہے۔ اس پر ڈھائی تین سیر میوہ
یعنی بادام اور پستے کھاتا ہے۔ اور دوپہر اور شام کو ڈھائی
سیر آٹے کی روٹیاں اور ایک متوسط درجہ کا بکرا کھا
جاتا ہے۔ اور اسی غذا کے مناسب اس کا تن و توش
بھی تھا۔ وہ ناشتہ کے لئے بیتاب تھا اور بار بار
تقاضا کر رہا تھا کہ کھانا جلدی منگوائیے مگر حکیم
صاحب جان بوجھ کے ٹال رہے تھے۔ یہاں تک کہ
بھوک کی شدت نے اُسے بیتاب کر دیا اور اب
وہ ناراض ہو کے اُٹھنے لگا تب حکیم صاحب
کھانا بھیجنے کا وعدہ کر کے اندر چلے گئے۔ تھوڑی
دیر اور ٹالا اور جب دیکھا کہ اب وہ بھوک کو
بالکل برداشت نہیں کر سکتا تو مہری کے ہاتھ ایک
خوان بھیجا جس کی صورت دیکھتے ہی پہلوان صاحب
کی جان میں جان آئی۔ مگر جب اُسے کھولا تو ایک
چھوٹی تشتری میں تھوڑا سا پلاؤ تھا جس کی مقدار
چھٹانک بھر سے زیادہ نہ ہوگی۔ پُر خور مہمان کو یہ چاول
دیکھ کے بڑا طیش آیا۔ جو اس کے ایک لقمہ کے لئے بھی
کافی نہ تھا۔ قصد کیا کہ اُٹھ کے چلا جائے مگر لوگوں نے

سمجھا بجھا کے روکا اور اس نے مجبوراً وہ تشتری اُٹھا کے منہ میں انڈیل لی۔ اور بغیر منہ چلائے نگل گیا۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے پانی مانگا۔ اور اس کے پانچ منٹ بعد پھر پانی پیا اور ڈکار لی۔ اب اندر سے کھانے کے خوان آئے۔ دستر خوان بچھا۔ خود حکیم صاحب بھی آئے۔ کھانا چنا گیا اور وہی پلاؤ جس میں کی سے ایک لقمہ پہلے بھیجا گیا تھا۔ اس کی پلیٹ جس میں کوئی ڈیڑھ پاؤ چاول ہوں گے۔ حکیم صاحب کے سامنے لگائی گئی۔ حکیم صاحب نے اس پلیٹ کو اس پہلوان کے سامنے پیش کیا اور کہا دیکھئے یہ وہی پلاؤ ہے یا کوئی اور؟" اور اس نے قبول کیا کہ وہی ہے۔ حکیم صاحب نے کہا "اب کھائیے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کی تیاری میں دیر ہوئی اور آپ کو تکلیف اُٹھانا پڑی"

پہلوان نے کہا "مگر اب مجھے معاف فرمائیے میں ابھی پہلے لقمہ سے سیر ہو گیا اور اب ایک چاول بھی نہیں کھا سکتا"۔ ہزار اصرار کیا گیا مگر اس نے ہاتھ روک لیا اور کہا "کھاؤں کیونکر؟ جب پیٹ میں جگہ بھی ہو حکیم صاحب نے وہ چاول نے کے سب کھا لیے اور اُس سے کہا "بیس بیس سیر اور تیس تیس سیر کھانا انسان کی غذا نہیں یہ تو گائے بھینس کی غذا ہوتی ہے۔ انسان

کی غذا یہ ہے کہ چند لقمہ کھائے مگر ان سے قوت اور توانائی وہ آئے جو بیس بیس سیر غلّہ کھانے میں بھی نہ آسکے۔ آپ اس ایک لقمہ میں سیر ہو گئے ......... کل پھر آپ کی دعوت ہے۔ کل آکے بتائیے گا کہ اس ایک لقمہ سے آپ کو ویسی ہی قوت و توانائی محسوس ہوئی جیسی کہ بیس سیر دودھ سیروں میوے اور گوشت اور غلّہ سے حاصل ہوتی تھی یا اس سے کم،، اور ہم سب کو بھی حکیم صاحب نے دوسرے دن مدعو کیا۔ دوسرے دن اس پہلوان نے آکے بیان کیا کہ " مجھے زندگی بھر ایسی توانائی اور چونچالی نہیں نصیب ہوئی تھی جیسی کہ کل سے آج تک رہی۔

نصیرالدین حیدر کے زمانے میں محمود نام ایک ولایتی شخص نے آکے فرنگی محل میں باورچی کی دوکان کھولی۔ اور اس کی نہاری کی ایسی شہرت ہوئی کہ بڑے بڑے رئیس اور شہزادے تک اس کی نہاری کی قدر کرتے۔ قدر دانی نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور اس نے شیرمال ایجاد کی جو آج تک لکھنؤ کا سرمایہ ناز ہے۔ روٹیوں کی بہت سی قسمیں مشہور اور مختلف شہروں میں مروّج ہیں۔ ایران سے مسلمان خمیری روٹیاں کھاتے اور ہندوستان کی سرزمین میں تنور گاڑتے ہوئے آئے تھے۔ مگر اس وقت تک

سادی روٹیاں تھیں۔ جن میں گھی کا لگاؤ نہ ہوتا۔ ہندؤں کی پوریاں تلتے دیکھ کے مسلمانوں نے توے کی روٹیوں میں گھی کا جز دے کے پراٹھے ایجاد کئے۔ اور پھر اُن میں متعدد پرتیں اور تہیں دینا شروع کیں۔ پھر اسی پراٹھے میں پہلی ترقی یہ ہوئی کہ باقرخانی کا رواج ہوا جو ابتداءً امرا کے دسترخوان کی بہت تکلفی روٹی تھی۔ لکھنو میں محمدو نے باقرخانی پر بہت ترقی دے کر شیرمال پکائی۔ جو مزے، بوباس، نفاست اور لطافت میں باقرخانی اور تکلفی روٹیوں کے تمام اصناف سے بڑھ گئی۔ شیرمال آج تک سوائے لکھنؤ کے اور کہیں نہیں پکتی اور پکتی بھی ہے تو ایسی نہیں پک سکتی۔ چند ہی روز میں شیرمال کو ایسی عام مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ لکھنؤ کی نیشنل روٹی قرار پا گئی۔ یہاں تک کہ جس دعوت میں شیرمال نہ ہو وہ مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن مسلمانوں کی نیشنل ڈش یعنی قومی غذا پلاؤ اور قورمہ ہے۔ لہذا سب سے زیادہ نزاکت و لطافت انہیں چیزوں میں دکھائی گئی۔ پلاؤ کے متعلق ہم بہت کچھ بیان کرچکے ہیں پھر بھی بعض باتیں باقی رہ گئیں۔

دولت مند اور شوقین امیروں کے لئے مرغ مشک و زعفران کی گولیاں کھلا کے تیار کئے جاتے۔

یہاں تک کہ ان کے گوشت میں ان دونوں چیزوں کی خوشبو سرایت کر جاتی اور ہر رگ وریشہ معطر ہوجاتا پھر ان کی یخنی نکالی جاتی اور اسی یخنی میں چاول دم دیئے جاتے۔

موتی پلاؤ کی یہ شان تھی کہ معلوم ہوتا چاولوں میں آبدار موتی ملے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے موتیوں کے تیار کرنے کی یہ ترکیب تھی کہ تولہ بھر چاندی کے ورق اور ماشہ بھر سونے کے ورق انڈے کی زردی میں خوب حل کئے جاتے۔ پھر اس حل شدہ مرکب کو نرخرے میں بھر کر ہر ہر جوڑ پر باریک دھاگا کس کے باندھ دیا جاتا اور اُسے خفیف سا جوش دے کے چاقو سے نرخرے کی کھال چاک کر دی جاتی اور سڈول آبدار موتی نکل آتے جو پلاؤ میں گوشت کے ساتھ دم کر دیئے جاتے۔ بعض رکاب دار پنیر کے موتی بناتے اور اس پر چاندی کا ورق چڑھا دیتے۔ بہرحال ایسی ایسی جدتیں عمل میں آتیں کہ اور کہیں لوگوں کے خیال میں بھی نہ آئی ہو ںگی۔

بعض رکاب داروں نے پلاؤ کی تیاری میں یہ صنعت دکھائی کہ گوشت کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں بنا کے خوب احتیاط سے اس طرح پکا کے کہ صورت نہ بگڑنے پائے۔ پلیٹ میں بٹھا دیں چاولوں کی صورت دانے کی کر دی۔ اور معلوم ہوتا کہ ہر مہمان کے سامنے پلیٹ میں

چڑیاں بیٹھی دانہ چگ رہی ہیں ۔ پھولے ہوئے سموسے جن میں سے توڑتے ہی لال نکل تے اُڑ جاتے ۔ حیدر آباد دکن میں غالباً لکھنؤ باورچی یعنی رکاب دار پیر علی لئے آ کر تیار کیے جو سرکاری ڈنروں میں میز پر آئے اور معزز مہمانوں کو بہت محظوظ کیا۔

---

# بزمِ قدرت

از

## مولانا محمد عبد الحلیم شررؔ لکھنوی

دنیا کی سب محفلیں تغیرات زمانہ سے درہم و برہم ہو جاتی ہیں مگر خدا کی مرتب کی ہوئی محفل جس میں انقلابات عالم سے ہر روز ایک نیا لطف پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ہمیشہ آباد ہے اور یوں ہی قیامت تک جمی رہے گی۔ یہ وہ محفل ہے جس کی رونق کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی۔ وہ پُرغم واقعات اور وہ حسرت بھرے سانحے جن سے ہماری محفلیں درہم و برہم ہو جایا کرتی ہیں اُن سے بزم قدرت کی رونق اور دوبالا ہو جاتی ہے۔ ہماری صحبت کا کوئی آشنا حرماں نصیبی میں ہم سے بچھڑ کے مبتلائے غربت ہو جاتا ہے۔ تو برسوں ہماری انجمنیں سونی پڑی رہتی ہیں۔ ہمارے عشرت کدوں کا کوئی زندہ دل نذرِ اجل ہو جاتا ہے تو سالہا سال کے لئے وہ ماتم کدے ہو جاتے ہیں۔ مگر جب ذرا نظر کو وسیع کرو اور خاص صدمات کا خیال چھوڑ کے عالم کو عام نظر سے دیکھو تو

اس کی چہل پہل ویسی ہی رہتی ہے۔ بلکہ نئی نسل کے دو چار پرجوش زندہ دل ایسے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ دنیا کی دلچسپیاں ایک درجہ اور ترقی کرجاتی ہیں۔ ایک شاعر کا قول ہے ؎

دُنیا کے جو مزے ہیں ہرگز یہ کم نہ ہونگے
چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہونگے

جس نے کہا ہے بہت خوب کہا ہے۔ بزمِ قدرت ہمیشہ یوں ہی دلچسپیوں سے آباد رہے گی۔ ہاں ہم نہ ہونگے۔ اور ہماری جگہ زمانہ ایسے اچھے نعم البدل لاکے بٹھا دیگا کہ ہماری باتیں محفل والوں کو پھیکی اور بے مزہ معلوم ہونے لگیں گی۔

الغرض یہ محفل کبھی خالی نہیں رہی کوئی نہ کوئی ضرور رہا جو اس بزم کی رونق کو ترقی دیتا رہا۔ اسی مقام سے یہ نازک مسئلہ ثابت کیا جاتا ہے کہ زمانے کی عام رفتار ترقی ہے۔ ایک قوم آگے بڑھتی دوسری پیچھے ہٹتی ہے۔ تنزل پذیر قوم کے لوگ اپنے مقام پر جب اطمینان سے بیٹھتے ہیں اور زمانہ و ملک کی شکایتوں کا دفتر کھول دیتے ہیں اور ان کو دعویٰ ہوتا ہے کہ زمانہ تنزل پر ہے مگر اصل پوچھئے تو تنزل صرف ان کی غفلتوں اور راحت طلبیوں کا نتیجہ ہے۔ دنیا اپنی عام رفتار میں ترقی ہی کی طرف جارہی ہے۔

اے وہ لوگو! جو شکایتِ زمانہ میں زندگی کی قیمتی گھڑیاں فضول گذار رہے ہو، ذرا بزمِ قدرت کو دیکھو تو کس قدر دلکش اور نظر فریب واقع ہوئی ہے۔ تمہارے دل میں وہ مذاق ہی نہیں پیدا کہ ان چیزوں کی قدر کرسکو۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ انسانی جوش کو بڑھاتی ہیں اور طبیعت میں وہ مفید حوصلے پیدا کرتی ہیں جن سے ہمیشہ نتیجے پیدا ہوئے اور پیدا ہوں گے۔ اندھیری رات میں آسمان نے اپنے شب زندہ دار دوستوں کی محفل آراستہ کی ہے۔ تارے کھلے ہوئے ہیں اور اپنی بے ترتیبی اور بے نظمی پر بھی عجب بہار دکھا رہے ہیں۔ دیکھو ان پیارے خوشنما تاروں کی صورت پر کیسی زندہ دلی اور کیسی تری و تازگی پائی جاتی ہے؟ پھر یکایک مہتاب کا ایسا حسین اور نورانی مہمان مشرق کی طرف سے نمودار ہوا اور یہ گورے گورے تارے اپنی بے فروغی پر افسوس کرکے غائب ہونے لگے۔ ماہ تاب آسمان کے نیل گوں اطلسی دامن میں کھیلتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ اگرچہ ہماری طرح دل داغدار لے کے آیا تھا۔ لیکن خوش آیا اور ہمارے غربت کدوں کو روشن کرکے بزمِ قدرت میں نہایت لطیف اور خوشگوار دلچسپیاں پیدا کرکے خوشی خوشی فلک کی سیر کرتا ہوا مغرب کی طرف گیا اور غائب ہوگیا۔ ابھی آسمان کو اس مہمان کا انتظار تھا جس سے نظامِ عالم کا سارا

کاروبار چل رہا ہے اور جس کی روشنی ہماری زندگیوں کی جان اور ہماری ترقیوں کا ذریعہ ہے۔ آفتاب بڑی آب وتاب سے ظاہر ہوا رات کا خوبصورت اور ہم صحبت چاند اپنے اترے ہوئے چہرے کو چھپا کے غائب ہوگیا اور آسمان کا اسٹیج بزم قدرت کے دل فریب ایکٹروں سے خالی ہوگیا۔

خوابِ شب کا مزہ اٹھانے والوں کی آنکھیں کھل کھل کے افقِ مشرق کی طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ آفتاب کی شعاعیں آسمان کے دور پر چڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں اس کے ساتھ مرغان سحر کے نغمہ کی آواز کانوں میں آتی ہے اور آنکھیں مل کے دیکھا ہے تو ہماری نظر کی خیرگی نہ تھی شمع حقیقت میں جھلملا رہی ہے۔ یک بیک وفورِ طرب نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ گھنٹے بجے چڑیاں چہچہائیں۔ موذنوں نے اذانیں دیں اور تمام جانوروں کی مختلف آوازوں نے مل کر ایک ایسا ہمہمہ پیدا کر دیا ہے کہ نیچر کی رفتار میں بھی تیزی پیدا ہوگئی۔ باغِ نیچر کے چابک دست کاریگر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ نسیم سحر اٹھکیلیاں کرتی ہوئی آئی اور ضابط ومتین غنچوں کے پہلو کو گدگدانے لگی۔

الغرض قدرت نے اپنی پوری بہار کا نمونہ آشکارا کر دیا۔

# زندگی بھی ایک معرکہ ہے

از

## جناب میر ناصر علی دہلوی

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

انسان کی خلقت کی نسبت مختلف عقیدوں کا ذکر چھوڑ کر ابتدائے آفرینش میں اگر آپ انسان کو دیکھئے تو دریا کے کنارے درخت کے سایئے میں پاؤں پھیلائے نظر آتا ہے۔ نہ اس کو کسی کا فکر نہ کسی کو اس کا فکر

نہ غم دُزد نے غم کالا

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ اِسے نیچر (عالم اسباب) سے غرض ہے، نہ نیچر کو اس سے۔ دونوں ایک دوسرے سے بے فکر بے غل وغش آرام سے بیٹھے ہیں۔ لیکن نہیں۔ نیچر انسان کو یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں دیا چاہتی یہ کیوں؟ اس لئے کہ زندگی نام ہے حرکت کا۔ بے جان

حرکت نہیں کر سکتے۔ جان کے لئے جنبش ضرور ہے۔ سکتے میں آئینہ دکھاتے ہیں کہ ذرا بھی جان ہوگی تو حرکت سے معلوم ہو جائے گی۔ زندہ اور مردہ کا امتیاز صرف حرکت سے ہو سکتا ہے۔ حرکت اور کام مرادف ہیں اور زندگی کا نتیجہ کام ہے۔

اب دیکھئے نیچر انسان کو کس طرح حرکت میں لائی؟ اس طرح کہ خود جنبش کی اور لاچار انسان کو جنبش کرنی پڑی۔

انسان نے دیکھا کہ سورج جو صبح سے چل رہا تھا شام کو ڈوبنے کو ہوا۔ حضرت انسان کو سوجھی کہ ہمیں بھی کہیں چلنا چاہئے کہ رات کو کوئی جانور آگیا تو اندھیرے میں دکھائی نہ دے گا۔ اور ہمیں کھائے گا۔ اس لئے وہاں سے سرکے۔

غذا جو صبح کھائی تھی وہ دوپہر کے بعد ہضم ہوگئی یعنی جزوِ بدن ہوگئی گویا نقل مکان کر گئی۔ جیسے حرکت کہئے اب پھر کھانے کو نہ ملا تو بھوک سے مرنا ہوگا۔ ان ضرورتوں سے انھیں زندگی کے لئے جنبش کرنی پڑی اب نکلے تو ضرورت کے واسطے مگر اس سے بڑے بڑے کام بن گئے یعنی اعضا میں توانائی آگئی۔ اور فکر میں دور دور کی سوجھی کہ دوسرے دن دیکھا تو برادری کے اور لوگ بھی اسی تلاش میں پھر رہے ہیں۔ ان

سے بازی لے جانے میں بڑی بڑی تدبیریں کرنی پڑیں
اور جہاں تک دوڑ کی سوجھتی گئی انسان اپنے ذہن میں ترقی
کرتا گیا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو مرجاتا ؎

منظور ہو جو چھپ کے ترقی تمہیں مری
یوں بڑھ چلوں کہ نشوونما کو خبر نہ ہو

انسان کو پہلے تو نیچر سے لڑنا پڑا پھر اپنی برادری سے کہ انسان انسان کو مار لیتا۔ کمزور زبردست سے بھاگتا یا چھپ جاتا ہے۔ چھپنے میں درخت کی آڑ بڑی پناہ کی سمجھے اس چھپتے پھرنے میں اتفاق سے درخت کی ٹہنی ہاتھ آگئی یا بھاگنے میں کوئی ٹہنی ٹوٹ پڑی تو گویا مقابلہ کے لئے سامان مل گیا۔ یہ آغاز لاٹھی سے کرب کی توپ تک کا ہے اس درخت کی ٹہنی جو اتفاق سے ہاتھ لگ گئی تمام ہتھیاروں کی گویا پردادی (مؤرثِ اعلیٰ) کہنا چاہیئے۔

اب لکڑی لے کر چلنے میں کمر سیدھی کرنے کی ضرورت اور آسمان و زمین کے قلابے ملنے لگے۔ کوئی ٹہنی ٹوٹنے میں اگر نوکیلی نکل آئی تو برچھی کی ایجاد ذہن میں آگئی۔ اور درخت سے ٹہنیاں توڑ توڑ کر حریف پر پھینکنا' نیزہ برچھی چلانے کا آغاز ہوا اور جب ٹہنی نہ ٹوٹی تو کچے پکے پھل پھینک کر مارنا گولی بارود کا مقابلہ ٹھہرا۔ اتفاق سے کسی ٹہنی کی نوک پتھر کی رگڑ سے تیز ہوگئی تو نکیلے پتھر ڈھونڈھ کر لکڑیاں تیز ہونے لگیں یہ چاقو کی ایجاد سمجھئے جس میں خنجر، تلوار، کٹار سب آگئے۔

اب تک زندگی کا علم گویا سائنس تھا آج
سے آرٹس گویا فنون شروع ہوئے۔ جو شخص نوکدار
چیزیں زیادہ دور پھینکنے لگا زیادہ ہوشیار سمجھا گیا۔ اس
سے تیر و کمان و نیزہ بازی و فلاخن وغیرہ پیدا ہوئے۔
انسان کو جس طرح اور کے مارنے کی تدبیریں سوجھیں
اپنے بچانے کی بھی تدبیریں سوچنی پڑیں۔ جنگل میں سب
سے بڑی آڑ درخت کی ہے۔ یہ گنجان ہوئے تو اُن
کے اِرد گِرد کی آڑ سے حفاظت ہوگی۔ جب اُن کی
آڑ چھوٹی تو انہیں کی شاخیں آڑ کے لئے ساتھ لے لیں۔
جو گویا ڈھال کا کام دے گئیں۔ یہ ڈھال و قلعہ وُدھس
وغیرہ کا آغاز سمجھئے۔

جس طرح توریت کا پہلا حکم یہ ہے کہ میرے سوا
تو کسی کو خدا نہ سمجھ۔ نیچر کا پہلا حکم یہ ہے تو بھوکا نہ رہ۔
ادنیٰ درجے کے جانداروں یعنی کیڑے مکوڑوں میں جو محض
سُن معلوم ہوتے ہیں صرف ان کے معدے میں حس ہوتا
ہے۔ مخلوق میں سارے حیوانات معدے سے جیتے ہیں۔ ہر
ذی حیات پیٹ کے پھندے میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ
ایک دفعہ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد بھی پھر اس
میں آکر پھنستا ہے۔

اس رات دن کی معرکہ آرائی سے تکلیف ہو
تو ہوا کرے۔ مگر اس بات کا فیصلہ کہ اس کش مکش

سے انسان کے ساتھ دراصل سلوک کیا گیا یا تکلیف دی گئی، ابھی مشکل ہے جب تک کہ اس کا انجام معلوم نہ ہو جسے عاقبت کہتے ہیں۔ عاقبت کا آغاز موت سے شروع ہوتا ہے۔ جانوروں میں موت کے یہ معنی ہیں کہ قویٰ ضعیف ہوجانے اور ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے دوسروں کی زندگی کا سبب ہونا اچھا ہے۔ یعنی جانور جانور کی غذا ہوجائے۔ جانوروں نے اپنی ہستی کا مآل بُرا نہیں رکھا۔ انسان بھی اپنی زندگی سے کوئی ایسا ہی کام لے۔ یعنی دوسروں کی زندگی کا سبب بنے اور بندگانِ خدا کے کام آئیے سہ

سب سے چھپا کے آپ اُٹھائیں ہماری لاش
پر یہ نہ ہو کہ اہلِ وفا کو خبر نہ ہو

انسان کا پہلا نقشہ حیوانیت کے متعلق تھا۔ اب انسانیت شروع ہوئی۔ اس کی زندگی کا وردِ سر دنیا کے لئے نیک فال ہے۔ اس کی زندگی طوفان سہی مگر طوفان بے تمیزی نہیں۔ اس کی پریشانی میں پریشان، زلفِ یار کا لطف ہے۔ شروع میں تو اس نے محض حیوانیت سے کام لیا کہ طاقت، چالاکی، مکر و فریب سے زندگی بسر کی۔ اس کے بعد آدمیت سے کام پڑا۔ کہ رزّاق مطلق سہ

بہ ناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

توانا روٹی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور نادانوں کو سوسائٹی پال رہی ہے۔ بیماروں کو چارپائی پر پڑے پڑے دوا مل رہی ہے۔ اور تندرستوں کو محنت مزدوری کر کے بھی پیٹ بھر کے روٹی نہیں ملتی۔ پہلوان بوتخمہ اور سوئے ہضمی سے مرتے ہیں اور فاقہ کشوں کو دردِ سر بھی نہیں ہوتا۔ دولت مندوں کو ہر طرح کے عیش پر بھی چین نہیں اور محتاج بہشت کے دعویدار ہیں

تو نیت ہو کہ ہست ہو یہ بے لگا دُرہ
ہو یا نہ ہو بقا و فنا کو خبر نہ ہو

# ایک یادگار مشاعرہ

از

## چکبست لکھنوی

تیرہ چودہ سال کا عرصہ ہوا کہ لکھنؤ میں پنڈت للتا پرشاد صاحب وثیقہ دار کے یہاں ایک معرکہ آرا مشاعرہ ہوا تھا۔ مصرع طرح یہ تھا۔

"اُگتی ہے جائے سبزہ کنگھی مرے چمن میں"

لکھنؤ کے قریب قریب تمام اساتذہ جمع تھے۔ لیکن جلال مرحوم نہیں تشریف لائے تھے۔ قریب ۴ بجے شام کے مشاعرہ شروع ہوا اور تقریباً دو بجے شب کو ختم ہوا تمام اساتذہ نے اپنے اپنے رنگ میں پر زور غزلیں کہیں تھیں اور پر زور غزلیں کس طرح نہ ہوں۔ اس زمیں آتش کی یادگار غزل کا نغمہ سب کے کانوں میں سمایا ہوا تھا۔ سبحان اللہ کیا کیا شعر فرمائے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، بزمِ خیال میں نورِ خدا داد کی شمعیں روشن ہیں۔

میرے دوستو! ذیل کے اشعار پر نظر ڈالو اور فصیح لکھنوی کی روح پر درود پڑھو

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں
دو روز ہے یہ لطفِ عیش و نشاط دُنیا
بوئے شبِ عروسی جہاں ہے پیرہن میں
بازار مصر میں چل یوسف کا سامنا کر
کھوٹے کھرے کا پردہ کھُل جائیگا چلن میں
اک تختہ ہفت کشور دہلی کا ہے ہماری
نو آسماں ہیں اپنے اکبر کے نو رتن میں
آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں
یادِ فقیر آگئے اُس بت کے بھولنا ہے
اب کی گرہ میں دوں گا زنّار برہمن میں
صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی
کیا کیا جلا ہے ساکھو پھولا جو ڈھاک بن میں

---

آخری شعر تو ایسا ہے کہ اس کا جواب اردو شاعری میں مشکل ہے۔ آتش کے بعد اساتذۂ قدیم میں آسیر مرحوم نے دو ایک شعر اس زمین میں خوب کہے ہیں فرماتے ہیں:-

تم رنگ ہو سخن میں تم پھول ہو چمن میں
تم روح ہو بدن میں تم شمع انجمن میں

گھر کر سحاب آیا نہروں میں آب آیا
دورِ شراب آیا، مستو! چلو چمن میں
آفت میں جانِ خستہ پائے اُمید بستہ
دل کشتیٔ شکستہ دریائے موجزن میں

---

امیر و داغ کی بھی غزلیں اسی طرح میں موجود ہیں اور دونوں نے ایک ایک شعر خوب کہا ہے۔

**داغ**

کیا کیا کدورتیں ہیں اس داغ دار دل کی
آتی ہے خاک لینے آندھی اسی چمن میں

**امیر**

کیا جانئے کہ چھوڑا پھولوں نے کیا شگوفہ
بلبل پکارتا ہے صیاد کو چمن میں

قدر بلگرامی کا بھی ایک شعر یاد آگیا ؎

لب پر ہنسی جو آئی دنداں کھلے دہن میں
چمکی یمن میں بجلی جاکر گری عدن میں

خیر، کجا بود مرکب کجا تاختم۔ کہاں حال کا مشاعرہ کہاں آتش و اسیر لیکن زمین ایک ہی ہے گو کہ گل کاریاں مختلف ہیں۔ پس نگاہِ شوق کا ایک "تختے" کی سیر کرتے ہوئے دوسرے "تختے" کی جانب بھٹک جانا قابلِ معافی ہے افسوس ہے کہ میرے پاس اس وقت مشاعرہ مذکور کی تمام

غزلیں موجود نہیں۔ جو کچھ قلیل سرمایہ اشعار کا حافظہ کی امانت میں موجود ہے۔ اسے قلم کاغذ کے سپرد کرتا ہوں۔ آرزومند دل لطف اُٹھائیں اور داد دیں۔ میر رضا حسین تنہا لکھنؤ کے ایک پرانے شاعر تھے۔ میر وزیر علی صبا کے داماد تھے، اور شاگرد بھی۔ ان کو فخر تھا کہ آتش کے رنگ میں کہنے والا اُن کے سوائے کوئی نہ تھا۔ آدمی کم استعداد تھے۔ مگر قدیم اساتذہ کے فیضان صحبت نے زبان کو صاف اور طبیعت کو برق کر دیا تھا۔ انہوں نے اس مشاعرے میں جو غزل پڑھی تھی۔ اس کے چند شعر لکھتا ہوں۔

فصلِ خزاں کے آتے کیسی ہوا چلی یہ
شمعِ مراد بلبل گل ہو گئی چمن میں
پہنچی یہاں تک ہے اب لاغری ہماری
بنتی ہیں دو قبائیں مجنوں کے پیرہن میں
آتش کی یہ زمیں ہے جل جائیں گی زبانیں
آہو نہ چر سکیں گے اس شیر نر کے بن میں

آغا مظہر صاحب مظہر ایک آزاد اور رنگین مزاج بزرگ تھے۔ ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ رہتی تھی اور زبان ظرافت کے چٹخارے سے کامیاب تھی اُن کی استعداد علمی معقول تھی اور مضمون آفرینی کی طرف طبیعت خاص طور سے مائل تھی۔ غالب کے بڑے مداح تھے اور جدت کے عاشق تھے اکثر کہا

کرتے تھے کہ جو شعر کہتا ہوں اُسے اپنا کر لیتا ہوں اس زمین میں بھی اچھے اچھے شعر کہے ہتے۔ دو تین شعر یاد رہ گئے:۔

کیوں حسن بے ادب ہے یوں عشق سے چمن میں
منقارِ بلبلوں کی غنچوں کے ہے دہن میں
اشکوں نے عطر کھینچا گل ہائے داغِ دل کا
تسخیر شمس شبنم کرتی ہے اس چمن میں
ناز و نیاز دیکھیں بلبل کے اور گل کے
ہم بھی چلیں چمن میں تم بھی چلو چمن میں

---

سید غضنفر علی خاں صاحب حکیم منشی اسیر کے بڑے صاحب زادے لکھنؤ کے گراں مایہ شاعروں میں تصور کئے جاتے تھے۔ عربی و فارسی کی استعداد کمال تک پہنچی ہوئی تھی اور علم عروض کے زبردست ماہر تھے مضمون آفرینی اور جدّت پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنے نامور باپ اسیر مرحوم کی مشکل پسندی کے رنگ کو بھی دو آتشہ کر دیا تھا۔

غزل میں بھرتی کا ایک شعر پڑھنا اُن کے لئے کسرِ شان تھا۔ اپنے نزدیک وہ ہر ایک شعر میں کوئی نہ کوئی جدّت اور استادی کا پہلو رکھتے تھے، اب یہ کہ اس کوشش میں کامیابی کہاں تک ہوتی تھی۔ اس کا

انصاف قدر دانوں پر تھا۔ عموماً ان کے اشعار سادگی کے جوہر سے معرّا ہوتے تھے۔ اور اکثر مغلق ہوتے تھے۔ لیکن کا کلام دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک استاد جیّد کا کلام ہے۔ جو شعر صاف نکل جاتا تھا وہ قیامت کرتا تھا۔

مشاعروں کی طرح پر وہ غزل بہت کم کہتے تھے۔ کیونکہ شاعری کا منصب مقدمہ بازی نے چھین لیا تھا۔ لیکن اس مشاعرے کے لئے انہوں نے بھی غزل کہی تھی۔ اور خوب کہی تھی۔ چند اشعار جو اس وقت یاد ہیں ہدیہ ناظرین ہیں:۔

پھر غیر غیر ہی ہے، گو ہے اس انجمن میں
بے گانگی سبزہ جاتی نہیں چمن میں
بچھڑ کا نمک اُسی جا موئے سپید نے بھی
زخمِ غمِ جوانی جس جس جگہ تھے تن میں
تنہا گئے لحد کو کب صاحبانِ دولت
وزدِ کفن کی نیت لپٹی رہی کفن میں
فصلِ بہار کتنی باتیں کریں گی تم سے
ہے باد کی گرہ وہ غنچہ ہے جو چمن میں
بلبل نے سر جو کھجلا گل نے دکھائی آنکھیں
کس سرکشی پہ سبزہ دب کر رہا چمن میں
نالوں سے بلبلوں کے گل تنگ آ کے بولے

یا یہ رہیں چمن میں، یا ہم رہیں چمن میں

---

نواب یوسف حسین خاں صاحب یوسف شرفائ لکھنؤ میں سے تھے اور قدیم تہذیب کے جوہر اور اوصاف ہونا چاہئیں وہ ان میں سب موجود تھے۔ ان کی زیارت کرنے سے روح کو بالیدگی حاصل ہوتی تھی۔ شاعری میں منشی اسیر کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کو ہمیشہ محبت سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی شاعری کے رنگ اور اسیر کے رنگِ سخن میں اندھیرے اُجالے کا فرق نظر آتا تھا۔ زبان آبِ کوثر میں دھوئی ہوئی بندشیں نورانی اور پاکیزہ شعر کیا ہوتا تھا گویا نور کا دریا بہتا نظر آتا تھا پڑھنے کا یہ عالم تھا کہ جس مضمون کا شعر پڑھتے تھے اس کی تصویر محض آواز کے اُتار چڑھاؤ اور آنکھ کی گردش سے کھینچ دیتے تھے معمولی سا شعر بھی اُن کی زبان سے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ میرے خیال میں اُن کی زبان خاص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تھی۔ اور شاعری کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی فصاحت اُن کے لئے پیدا ہوئی تھی اور وہ فصاحت کے لئے۔

اللہ رے صفائے بیانِ حدیثِ دوست
دم بند ہے فصاحت اہلِ حجاز کا

اُنہوں نے جو غزل مشاعرے کے لئے فرمائی تھی اُسکا

رنگ تمام غزلوں سے جداگانہ تھا اور خاص ان کے مذاقِ سخن کا نشان دیتی تھی۔ چند اشعار لکھتا ہوں

بوتل کے کاگ اُڑ کر نکلی ہے مے چمن میں
ٹوپی اُچھل رہی ہے مستوں کی انجمن میں

ساغر بھرے دھرے ہیں ساقی کی انجمن میں
لہرا رہا ہے کوثر فردوس کے چمن میں

صیاد کا ہے دھڑکا پھولوں کی انجمن میں
ہاتھوں اُچھل رہا ہے بلبل کا دل چمن میں

کس نے کہا کہ بیٹھو پھولوں کی انجمن میں
حسرت بھری نگاہیں نرگس کی ہیں چمن میں

پتوں سے نخل گلشن دستک جو دے رہے ہیں
چوری گیا ہے شاید بلبل کا دِل چمن میں

وہ کونسا حسین ہے تم پر نہیں جو مرتا
بھرتا ہے حسن یوسف پانی چہ ذقن میں

مرنے کے بعد ایسے ہم کچھ ہوئے تبرک
بوسید گی نے چوما ہر استخوان کفن میں

ہر رنگ کے گلوں نے ڈالا جو عکس یوسف
طاؤس بن گئی ہے باد صبا چمن میں

مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب یوسف حسین خاں صاحب نے یہ شعر پڑھا کہ "مرنے کے بعد ایسے الخ تو حکیم صاحب نے بہت تعریف کی۔ وجہ یہ تھی کہ

یہ شعر خاص ان کے رنگ کا تھا مگر باوجود اس کے حضرت یوسف کی زبان کی جلا اس میں بھی موجود ہے
پنڈت بشن نرائن صاحب در کی ابتدائی شاعری کا یہ زمانہ تھا اُن کا بھی ایک شعر یاد رہ گیا۔

گل کے جو کان اُڑائے بک بک کے بلبلوں نے
بولی کلی چٹک کر کیا شور ہے چمن میں

ایک پُرانی وضع کے بزرگ موجود تھے اور غالباً منشی اسیر مرحوم کے شاگرد تھے انہوں نے ایک رنگِ قدیم کا شعر کہا تھا ؎

دریائے خون عاشق لہریں جو لے رہا ہے
بے تاب مچھلیاں ہیں بازوے تیغ زن میں

مگر جو شعر حاصل مشاعرہ ثابت ہوا اور جس کی دھوم دوسرے روز تمام شہر میں ہو گئی وہ شعر حضرت بدر کا تھا۔ حضرت بدر کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جناب حکیم کے شاگرد تھے اور لکھنؤ کے پرانے نواب زادوں میں تھے اور دولت کثیر رکھتے تھے اور شعر بھی تفنن طبع کے طور پر کہہ لیا کرتے تھے۔ اس مشاعرے میں انہوں نے یہ شعر پڑھ کر قیامت کر دی ؎

دامن کو چاک کر کے رسوا ہوئی ہے کیا کیا
تھی عصمت زلیخا یوسف کے پیرہن میں

اس شعر کے علاوہ تمام غزل پھیکی ہے اور اس شعر کا مضمون بھی آتش کے ایک شعر سے لڑتا نظر آتا ہے ؂

نہ پھاڑ ناتھا زلیخا کو دامنِ یوسف
یہ اس کا پردۂ عصمت دریدہ ہونا تھا

لیکن حق یہ ہے کہ بدرؔ کا شعر صفائی و بندش کے لحاظ سے آتش کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے اور یہی اسکے مقبول ہونے کا باعث ہوا۔

نواب ہادی علی خاں یکتا ایک آزاد منش بزرگ ہیں۔ غزل کم کہتے ہیں لیکن تخمیس کے بادشاہ ہیں اور اس رنگ میں ان کا جواب لکھنؤ میں نہیں ہے۔ غالباً وجہ سے تخلص یکتا رکھا ہے۔ اس مشاعرے میں آتش کی غزل پر انہوں نے مصرعے لگائے تھے جو کچھ یاد ہے لکھتا ہوں ؂

"تو من شدی" کا غُل ہے ہر سو ہر ایک بن میں
"من تو شدم" رچا ہے فرہاد کوہ کن میں
یہ اتفاق باہم کمتر ہے مرد و زن میں
شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلا پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

ساماں ظاہری ہے، یہ اختلاطِ دُنیا
کس پھیر میں پڑا ہے چھوڑ ارتباطِ دُنیا
جب ایک دن فنا ہے پھر کیا بساطِ دُنیا

دو روز ہے یہ لطفِ عیش و نشاطِ دُنیا
بولے شب عروسی مہماں ہے پیرہن میں

مشاعرے کے بعد حضرتِ یکتا ایک روز ملے اور حضرت بدر کے شعر پر مصرعے لگائے تھے وہ سنائے۔ وہ بھی لکھتا ہوں:۔

عاشق ہوئی ہے کیا کیا شیدا ہوئی ہے کیا کیا
بے دل ہوئی ہے کیا کیا جویا ہوئی ہے کیا کیا
در پردہ یہ قیامت برپا ہوئی ہے کیا کیا
دامن کو چاک کر کے رسوا ہوئی ہے کیا کیا
تھی عصمتِ زلیخا یوسف کے پیرہن میں

علاوہ اُن حضرات کے جن کے اشعار میں نے لکھے ہیں بہت سے شعرا جمع تھے اور غزلیں بھی پڑھی تھیں مگر مجھے اسی قدر اشعار یاد رہ گئے۔ اب تک میری نگاہوں کے سامنے اس مشاعرے کی تصویر ہے۔ کم سے کم ڈیڑھ سو حضرات نے غزلیں پڑھی تھیں جن میں اساتذہ بھی تھے۔ شاعر بھی تھے۔ خوش گو بھی تھے اور محض تخلص کے گناہ گار بھی تھے اور سامعین کی تعداد دو سو تین سو سے کم نہ تھی۔ جب اچھا شعر پڑھا جاتا تھا تو قدر دانوں کی تعریف اور واہ واہ کے نعروں سے یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ چھت اُڑ جائے گی۔ ایک طرف منظہر مرحوم کے چٹکلے رونے کو ہنسانے تھے دوسری جانب جناب

حکیم مرحوم کی مولویانہ اور ادب آمیز ظرافت اپنے رنگ میں مزہ دے جاتی تھی۔ نواب یوسف حسین خاں کی نورانی صورت سے تمام محفل نورانی ہو رہی تھی ہادی علی خاں صاحب یکتا کا انداز تعریف قیامت تک نہ بھولے گا۔ افسوس ہے تو یہ ہے کہ اب یہ رنگ دیکھنا نہ نصیب ہوگا۔ پانچ چھ سال کا عرصہ ہوا جناب حکیم نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ حضرت مظہر کے مرنے سے بزم احباب سونی ہو گئی۔ نواب بنے صاحب مشتاق بھی اس مشاعرے میں موجود تھے مگر غزل طرح پر نہیں پڑھی تھی۔ موت نے جوانی ہی کے عالم میں انکا بھی خاتمہ کر دیا۔ ایک نواب یوسف حسین خاں باقی رہے تھے افسوس ہے پار سال طاعون کی ہوا سے وہ چراغ بھی گل ہو گیا۔

جناب جلال کا زخم ابھی تازہ ہے ؎

اُٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجئے

اب مشاعرے ہوں تو کیونکر ہوں۔ خیر خدا عزیز و محشر کو سلامت رکھے کہ انہوں نے مشاعروں سے علمی مذاق کا سلسلہ قائم کیا ہے ورنہ زمانۂ حال کے نوجوانوں کی طبیعتیں تمام سنجیدہ مشاغل سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی میں شعر و سخن کے مذاق کا خون بھی شامل ہے رسا کھینچنا

ہاکی یعنی ولایتی گلی ڈنڈا کھیلنا۔ ٹینس کے دام میں اسیر رہنا اب تہذیب و شایستگی کا معراج خیال کیا جاتا ہے لیکن عقیدت منددل مشاعرے کے بدلے مشاعرے کی یاد ہی سے طبیعت کو تازہ کر لیتے ہیں۔ ورنہ یہ چمن اب کہاں ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

(مضامین چک بست)

# ملکۂ محبت

از

## مولانا راشد الخیری دہلوی

آفتاب و ماہتاب کچھ کے کچھ ہو جائیں۔ زمانہ کی رفتار میلوں اور کوسوں آگے بڑھ جائے۔ آسمان کروٹ پر کروٹیں لے اور زمین چکروں پر چکر کاٹے مگر قانونِ قدرت کے سنگلاخ پہاڑ اپنی جگہ سے سرکنے والے نہیں! چاند کی آب و تاب تاروں کی چمک دمک، سورج کی طلوع و غروب کی سمتیں جو آج سے ہزار برس پہلے تھیں وہی آج ہیں اور اُس وقت تک اسی طرح رہینگی جب تک کسی سیارے کی ٹکر یا صانعِ حقیقی کا حکم اِن تمام اسباب کا خاتمہ نہ کر دے۔

کائناتِ دہر کے متضاد نتائج حیاتِ انسانی کی مختلف حالتیں، انواع و اقسام کے تماشے رنگ برنگ کی کیفیتیں پیش خیمہ ہیں اس انقلاب کا جو عمر کے باقی حصّہ میں ہونے والا ہے اور خبریں ہیں اُس وقت کی جب جسدِ خاکی اِن تغیرات سے بے تعلق ہو گا۔

یہ واقعات اگر صنعت تسلیم کر لئے جائیں تو لاجرم اِس کا صانع ماننا پڑے گا! وہ نیچر ہو یا خُدا مگر اِس استادی کے قائل ہیں کہ باعتبار ضرورت پارس بناکر بھیجا اور کُندن بناکر چھوڑا! کچھ ایسا دلچسپی کے سانچے میں ڈھالا کہ اس حیاتِ ناپائدار پر کیسی ہی تکلیفیں اور کتنی ہی پریشانیاں کیوں نہ گذریں۔ آفتوں پر آفتیں آئیں۔ مصیبتوں پر مصیبتیں ٹوٹیں، چاہو کہ اس پیرزال کی نیرنگیوں سے دل اُکتا جائے ممکن نہیں۔

اسی منزل گاہِ راحت وعیش میں جہاں باجے گاجے کے غُل غپاڑے سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ وہاں شہر سے باہر ایک کونہ میں چھوٹا سا قبرستان بھی ہے جس میں ٹوٹی پھوٹی پُرانی قبریں اُن خوشیوں کی بے ثباتی کا پتہ دے رہی ہیں! یہ مٹی ہوئی صورتیں جو آج اس سنسان میدان اور ہُو کے عالم میں بے خبر پڑی ہیں۔ کل اسی منزل گاہ میں شاداں و فرحاں پھر رہی تھیں! فارغ البالی کے چنور ان کے سروں پر سایہ کئے تھے۔ اور حیاتِ مستعار ان پر راحت و اطمینان کے پھول برسا رہی تھی۔ عزیزو! تعلقات کا اثر جیسا تم پر ہے ایسا ہی اُن پر بھی تھا۔ جس طرح تمہارے دلوں میں ارمان ہیں اُن کے بھی تھے! بادِ صبا کی اٹکھیلیاں جس طرح تمہارے ساتھ ہیں اسی طرح اُن کے ساتھ بھی تھیں۔ یہ چاند تارے بھی جو

آج ہمارے سامنے ہیں۔ اُن کے سروں پر بھی تھے قدرت کی تمام دلچسپیاں جوں کی توں ہیں مگر اس کی بہار دیکھنے والے بدل گئے! یہ نیند کے متوالے جن کے ڈھیر پیشِ نظر ہیں اس فراقِ ابدی سے خوش نہ تھے جاگ سکیں تو ان کو اٹھاؤ اور اُن سے پوچھو کس دل سے گئے۔ اور کس حال میں رہے۔ بڑی طاقت ور تھی وہ چیز جو اِن غریبوں کو ایسی چہل پہل سے اُٹھا لائی۔ اور اس جنگل بیابان میں لا لٹایا۔ فاختہ کی کو نے اِن نووارد مہمانوں کو لوری دی۔ املی اور نیم کی پتیاں ان کو تھپکنے لگیں گو یہ پیاری صورتیں ہمیشہ کو چھوٹ گئیں۔ ان کے شکوے شکایت سب ختم ہوئے اور اب ہمیں اِن سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں۔ مگر نہیں! کبھی تو اِن کی بھی خاطر منظور تھی! زندوں کی ملاقات کا لطف تو بہت اٹھایا۔ آؤ آج اِن مردوں کی صحبت میں بھی شریک ہوں۔ واہ واہ کیسی بارونق محفل جمی ہوئی ہے۔ چھوٹے بڑے بڈھے، جوان ایک لباس، ایک وضع، ایک قطع، ننگے سر، ننگے پاؤں اپنے اپنے کارناموں پر فخر کر رہے ہیں! بہت سے خلق و محبت کے بندے ہیں جو اپنی بیش بہا زندگی دوسروں پر نثار کر گئے۔ گو خالی ہاتھ رہے اور خالی ہاتھ آئے مگر ایسے خزانے اپنے ساتھ لائے جو کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ کیسے مستقل مزاج لوگ تھے۔ مصیبتیں جھیلیں۔ آفتیں بھگتیں۔

مفلس بچے، قلاش مرے مگر خلوص کے لہلہاتے پھول، جو ماں کے پیٹ سے لائے تھے اُنہیں نہ مُرجھانے دیا۔ دیکھو اور نظر غور سے دیکھو! زندگی کا سہارا انہیں کے سر ہے۔ جیتے جی تو اِن کی کچھ وقعت نہ تھی، مگر آج ان کی صورتیں دیکھنے کے قابل ہیں بڑے بڑے عبادت گزاروں کی ٹکٹکی ان کے چہروں پر بندھی ہوئی ہے اور یہ آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھتے! حاصلِ عمر دوسروں کی نذر کردیا۔ عزت کے خواہاں رہے نہ دولت کے طالب، اُن کی آرزو، اُن کے ارمان، اُن کی خواہش، اُن کی اُمنگیں جو کچھ تھیں، یہ تھیں کہ دوستوں کا دَم بھرتے، پیاروں کا نام لیتے، دنیا سے رخصت ہوجائیں خوش نصیب تھے یہ آپ اور غنیمت تھی اُن کی زندگی!

جنگل بسانے والو! گو ہم سے رخصت ہوگئے۔ اور ایسے رخصت ہوئے کہ اب نظر نہ آؤ گے۔ مگر زیست تھی تو تمہاری۔ اور انسان تھے تو تم۔ یہ چوتھی کی دُلہن، یہ حسین ملکہ جو آج سنہری کٹہرے میں تمہارے پاس آرام کر رہی ہے۔ تمہارے ہی قابل تھی۔ اب اس کے قدر دان کہاں۔ اور پوچھنے والے کدھر۔ خدا جانے کس صورت شکل کی عورت ہوگی جس کی قبر پر یہ کچھ نور برس رہا ہے، دو رویہ گلوں کی قطاریں رنگ برنگ کے پھول، مقناطیسی اثر دکھا رہے ہیں۔ سرہانے سنگ مرمر کا ایک پتھر ہے۔ جس پر کندہ ہے "ملکہ محبت کی آرام گاہ"۔

(مخزنِ ادب)

# نابینا بیوی

از

## سلطان حیدر جوش دہلوی

میرے گھر کے برابر دیوار بیچ ایک قاضی صاحب کا مکان تھا یہ بے چارے ایک زمانہ میں بڑے متمول آدمی تھے مگر ریاست کی زندگی اور خصوصاً ملازمت انقلاب کی تصویر ہوا کرتی ہے۔ زرا راجہ صاحب کے کان بھرے اور بے قصور آفت برپا ہو گئی۔ اسی طرح ان شریف قاضی صاحب کے تمول نے افلاس کا پہلو بدلا اور فقط پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار کی قلیل رقم بہ ہزار دقت بچ بچا کر رہ گئی۔ اسی پر صبر و شکر کر کے قانع تھے اور اپنا اپنی بیوی اور بیٹی کا پیٹ پالتے تھے۔ عربی اور فارسی کی قابلیت کے لحاظ سے دور دور انکا شہرہ تھا اور باہر سے اکثر ایسے اشخاص مشکل مشکل مسئلے حل کرنے آیا کرتے تھے۔

قاضی صاحب کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب

جب ہوئی تو نکاح میں مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ گو چند در چند ضروریات کی وجہ سے میں شامل نہ ہو سکا مگر ہمسایہ تھا جو واقعات برات کے روز پیش آئے انکی خبر برابر مل گئی۔

معلوم ہوا کہ حسبِ معمول دولہا صاحب کو پہلے سے اس لڑکی کی نسبت جس سے اب اُن کی قسمت وابستہ ہونے والی تھی کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ اور عین نکاح کے وقت نامعلوم کس بات کے علم پر ان نئی روشنی کے شیدا انگریزی تعلیم یافتہ دولہا صاحب نے شادی سے قطعی انکار کر دیا۔ طرفین کی بڑی بدنامی ہوئی اور آخرکار برات یوں ہی واپس گئی۔ اس کے بعد خود دولہا صاحب سے میری راہ و رسم ہو گئی اور اس شادی سے انکار کرنے کی وجہ اس غریب لڑکی کی بد چلنی ظاہر کی۔ یہ بات سُن کر میرے خیالات بھی قاضی صاحب کی طرف سے خراب ہونے لگے اور میں نے ان سے ملنا جُلنا کم کر دیا۔ کبھی کبھار وہ اگر مجھ سے ملتے تو شکایت کرتے۔ مگر میں ٹالے بالے بتا کر پیچھا چھڑا لیتا۔ اور راستہ میں بھی ان سے کترا کر نکل جاتا وہ در اصل مجھ سے محبت کرتے تھے اور میرے والد بزرگوار کے بڑے سچے دوست تھے۔

اسی طرح تقریباً چھ مہینے گذر گئے اور اب گرمی

کا موسم آن پہنچا۔ میری والدہ ضعیف تو صحن میں ہی
سویا کرتی تھیں مگر میں اکیلا چھت پر لیٹا کرتا۔ ایک
دفعہ مجھے خوب یاد ہے جمعہ کا دن تھا چلچلاتی گرمی تھی
اور پہر بھر دن رہے سے ہی ہوا بند ہو گئی تھی دونو
وقت ملتے ہی مارا مار کر کے میں نے کھانا کھایا اور حقّہ
لیکر سیدھا کوٹھے پر جا پڑا چاروں طرف اُجلی اور
شفاف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور تارے اکّا دُکّا نظر
آتے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر ایک آدھ جھونکا ہوا کا آہستہ
آہستہ آتا اور پسینے میں نہائے ہوئے بدن کو ٹھنڈا
کر جاتا۔ دماغ میں عجیب فرحت ہوتی اور تھوڑی
دیر کے لئے میں پنکھا ہاتھ سے رکھ کر حقّے کا ایک
آدھ گھونٹ پی لیتا۔ دو تین گھنٹے یوں ہی کروٹیں
بدلتے اور ہاتھ پاؤں مارتے کٹے۔ خدا خدا کر کے
گیارہ بجے ہوا ذرا سرسرائی اور کچھ جان میں جان آئی
چونکہ پہلے سے ہی آنکھیں بند کر کے زبردستی نیند کو
بلا رہا تھا فوراً غنودگی آنے لگی۔ سنّاٹے کی وجہ سے
اِدھر اُدھر کی آوازیں بھی رہ رہ کر آجاتی تھیں
یکایک مجھے یہ معلوم ہوا کہ کوئی میرے سرہانے بول رہا
ہے اور میں فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
چاروں طرف گھنٹوں دیکھتا رہا مگر آدمی تو آدمی پرچھائیں
تک نظر نہ آئی۔ تاہم پھر بھی میں اسی طرف متوجہ رہا

ہوا کے جھونکے کے ساتھ ہی ایک درد بھری آواز آئی
اور مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ قاضی صاحب کے مکان کی چھت
پر سے آ رہی ہے۔ اب میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور سننے
اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے
خیال کے موافق ہوا کے ساتھ آواز آئی:-

"خدا جانے لوگ باگ کیا سمجھیں؟ اور کیوں کر
ہر جگہ میری بدنامی ہوتی ہو؟ مگر خیر! وہی
رب العالمین خوب جانتا ہے۔ مجھے اور کسی سے
غرض ہی کیا؟ مگر پھر بھی دنیا میں بُرا نام
نکل جانا بہت .........."

آواز تھوڑی دیر کے لئے جاتی رہی اور پھر ہوا کے ساتھ
آئی:-

"پاک بے نیاز! رب العالمین! میرے اوپر رحم
کر میری مشکل کو آسان کر دے۔ تیرا خوف ہر
ہر لحظے بُری حالت کئے دیتا ہے اور یہ شیطان
مردود ہر دم کیسے کیسے بھلاوے دیتا ہے غریبوں
کی مدد کرنے والے! اب سوائے تیرے اور کس کا
سہارا ہے۔ میں تجھ سے .............."

(سکوت طاری ہو جاتا ہے اور پھر ہوا کے جھونکے کیساتھ
آواز آنی شروع ہوتی ہے)

"........ اور یہ بھی ہے کہ پاک پروردگار

یں یہ نہیں چاہتی کہ میری شادی ہو جائے کیونکہ
مجھ دکھیاری اندھی کو کون قبول کرے گا ؟ مگر
ہاں یہ ضرور ہے کہ میں پاک ہوں اور باعصمت
ہوں اور اب سے ہیں یہ چاہتی ہوں کہ میری
بدنامی نہ ہو اور بُرا کہنے والوں اور مجھ پر
الزام لگانے والوں کا منہ تو بند کر دے
ارحم الراحمین تو خود دیکھتا ہے کہ میں آج تک
کس قدر نیک اور پاک ہوں ......"

ہوا کے رک جانے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے
خاموشی ہو جاتی ہے اور یہ پھر یہ الفاظ سنے جاتے ہیں :۔

"......... بے شک ہے آخر کو میں بھی
جوان ہوں اپنی ہم جولیوں کی باتیں سنتی ہوں
تو ضرور رشک ہوتا ہے مگر پاک بے نیاز !
میں اس بات کی شکایت نہیں کرتی کہ تو نے
مجھے اندھی کیوں پیدا کیا ؟ اور ہر ایک مجھ
سے شادی کرتے کیوں کانوں پر ہاتھ دھرتا
ہے۔ میں ہر طرح تیری رضا پر راضی ہوں
اور ہر حالت میں تیرا ہزار ہزار شکر کرتی
ہوں۔ البتہ صرف ایک بات چاہتی ہوں
کہ یا تو جوانی کی امنگ اور جوش کو ملیامیٹ
کر دے کہ میری زندگی آرام سے بسر ہو اور نہیں

تو پھر عزّت و آبرو کے ساتھ میرا پردہ
ڈھانک لے۔ مجھے اس جھوٹی اور مکّار دنیا
سے باعصمت اُٹھا لے"

اِن آخری درد بھرے جملوں کے بعد پھر کوئی آواز قطعی نہ آئی اور بڑی دیر تک کچھ زیادہ سننے کی کوشش کرکے آخر کار میں لیٹ گیا۔ وہ الفاظ میرے چوٹ کھائے ہوئے دل کے ساتھ نمک کا کام کرتے رہے۔ اور مجھے ساری رات آنکھوں میں کٹی۔

صبح ہوتے ہی میں نے جناب والدہ صاحبہ کی اجازت پر اپنے ایک دوست کے ذریعے سے پیغام بھیجا اور قاضی صاحب کی غلامی میں اپنے آپ کو دینا چاہا مگر ان سچّے اور پاکباز قاضی صاحب نے اس کے جواب میں آبدیدہ ہو کر کہہ دیا:۔

"اُن سے یہ کہہ دینا ابھی صاحبزادہ ہو ناتجربہ
کار ہو۔ کیوں اپنی زندگی تلخ کرتے ہو
وہ بدنصیب لڑکی اندھی ہے اور میں
تمہارے مرحوم بزرگوار کا نیاز مند ہوں
میں نہیں چاہتا کہ میری لڑکی کی وجہ
سے تمہیں مصیبت اُٹھانی پڑے۔ اگر
تمہیں اس کی وجہ سے کوئی تکلیف پہنچی
تو میں قیامت کے دن تمہارے والد مرحوم کو

کیا منہ دکھاؤں گا؟"

اس جواب نے اور میرے درد بھرے دل نے تھوڑی دیر کے لئے مجھے بالکل سکتے میں کر دیا۔ مصیبت اور مایوسی کی زندہ تصویر میرے سامنے تھی اور اس نے میرے دل پر اس قدر زیادہ اثر کیا تھا کہ میری آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ نکلتا تھا۔ بمشکل تمام میں نے قاضی صاحب کو کئی دنوں میں مجبور کر لیا اور اس مصیبت زدہ نابینا لڑکی کے ساتھ چپ چپاتے ہی شادی کر لی اب وہ کم نصیب لڑکی میرے گھر میں آئی اور میری بیوی بنکر رہنے لگی۔ ان کے ذاتی خصائل کی نسبت میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ صبر، قناعت، سچائی، ہمدردی، محبت اور پاکبازی کی مجسم تصویر تھی اور اکثر اوقات پچھلی رات کو میری آنکھ کھل جاتی تو میں ایک عجیب موثر نظارہ دیکھتا وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے نہایت عاجزی اور منت و زاری کے ساتھ دعا میں مشغول ہوتی اور ہزار طرح سے پہروں میری ترقی، آرام، و آسائش کی دعائیں پھڑک پھڑک کر دل سے مانگا کرتی۔ حتی الامکان میں بھی اس کی خوشی کا خیال از حد رکھتا اور کبھی اس کی طرف سے غافل نہ رہتا جب تک میری والدہ ضعیفہ زندہ تھیں میری نابینا بیوی کو میرے حاضر و غیب تک کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچی مگر انہوں نے بھی اس دار فانی کو الوداع کہا،

اور ان کے صدمے نے اور زیادہ میری ہمّت پست کر دی اب گھر میں صرف ایک خادمہ تھی اور ڈیوڑھی پر فقط ایک نوکر۔ والدہ صاحبہ مرحومہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی خادمہ نے اُسے تکلیف پہنچانا شروع کی مگر میں سچ عرض کرتا ہوں کہ کبھی بھول کر بھی اُس نے خادمہ کی شکایت مجھ سے نہیں کی اور مجھے اس بات کی قطعی اطلاع نہیں ہوئی۔

ایک روز میں اتفاقیہ خلاف معمول دوپہر کو گھر میں واپس آیا جب کہ میری بیوی کھانا کھا رہی تھی اور خادمہ دسترخوان کے پاس بیٹھی تھی۔ سالن وغیرہ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا اور میں اس ماما کو بُرا بھلا کہنے لگا کیونکہ پورے خرچ پر بھی کھانا بہت خراب تھا اور اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے اچھا کھانا کھلاتی تھی اور میری غریب نابینا بیوی کے سامنے روکھی سوکھی روٹیاں اور بچا کھچا سالن رکھ دیتی تھی اور باقی سب اچھا اچھا نیر کر دیتی تھی۔ اس دن سے میں صبح کو جب تک میری قابل رحم بیوی ضروریات اور نماز سے فارغ نہ ہو لیتی باہر نہ جاتا اور دوپہر سے پہلے واپس آکر کھانا اسی کے ساتھ کھاتا اور پھر شام سے ہی گھر میں آپڑتا۔ اور تمام رات کہیں نہ نکلتا۔ اس کی سچی محبت اور راست بازی نے اس قدر میرے دل میں گھر کر لیا تھا۔ کہ

کہ اکثر ماما کے نہ ہونے پر میں خود کام کرتا اور اس کے لئے وضو وغیرہ کے واسطے پانی لانے میں مجھے کچھ عار نہ آتی۔ اس طرح گھر میں گھسے رہنے کی وجہ سے دوست احباب مجھ پر فقرے کسنے لگے اور ہر جگہ میرے ہم عمر میرا مضحکہ اُڑانے لگے۔ مگر اس کا خیال میں نے کچھ بھی نہ کیا اور میرے معمول میں ذرّہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ اسی اثنا میں ان نئے تعلیم یافتہ نوجوان کی شادی جنہوں نے میری نابینا بیوی پر بدچلنی کا جھوٹا الزام لگایا تھا بڑی دھوم سے ہوئی اور وہ بہت خوشی کے ساتھ ایک متمول لڑکی کو اپنے گھر لائے۔ مشکل سے ایک برس گزرا ہوگا کہ شکر رنجی ہوئی اور بڑھتے بڑھتے خانہ جنگیوں کی نوبت آئی اگرچہ میں تو اب بھی ایک معزز آدمی کی بیٹی کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنا لغو سمجھتا ہوں تاہم تمام شہر میں یہی افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ ان کی بیوی آوارہ اور بدچلن ہے۔ انہوں نے اسے نکال دیا اس نے اپنے میکے پہنچتے ہی نان نفقہ اور مہر کی نالش ٹھونک دی اور تعلیم یافتہ نوجوان کو چھٹی کا کھایا ہوا یاد آگیا۔

غرض خوب عرضی پرزہ ہوتا رہا اور ان پر ان کی بیوی کی ڈگری ہو گئی۔ اب انہوں نے خاندان کے بزرگوں کے سامنے منت سماجت کی

اور بہ مشکل تمام وہ معاملہ رفع دفع ہوا اور اُن کی بیوی
پھر اُن کے گھر میں آ گئیں۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد پھر
وہی تھکا فضیحتی شروع ہو گئی۔ بہرحال اس ڈگری کا
خوف اُن کا غصّہ دباتا تھا اور یہ ہمیشہ اپنی بیوی سے
جوتیاں کھاتے رہے تھے۔ اس دارِ ناپائدار کے قانون
سے موافق مجھ بدنصیب پر ایک مصیبت نازل ہوئی
اور میری نابینا بیوی کو بخار آنے لگا۔ میں نے ڈاکٹر
حکیم، مُلّا ملنے، سیانے، دوا، ٹھنڈائی، گنڈا تعویذ غرض
کچھ نہ چھوڑا۔ مگر بخار میں کمی نہ ہوئی تھی نہ ہوئی۔
وہ دن بھر اس مرض کی شدّت میں لہلاتی رہتی اور
اس کے حواس پر بنی رہتی۔ میں نے بالکل ہر جگہ کا
آنا جانا چھوڑ دیا اور ہر وقت گھر ہی میں رہنے لگا
وہ برابر چھ مہینے تک بیمار رہی اور اس عرصہ
میں ہر قسم کی خدمت میں نے ہی کی۔ یہاں تک کہ
چوکی پر لے جانا، دوا ٹھنڈائی پلانی وغیرہ میرا روزانہ
معمول تھا۔ چونکہ اُسے آخر دنوں میں ڈاک بھی لگ
گئی تھی۔ اس لئے اُگال دان یا سیلبچی لاکر اس کے سامنے
میں ہی رکھا کرتا تھا اور اکثر نفے کی جلدی اور گھبراہٹ
میں ایسا بھی ہوا ہے کہ میرے اُگال دان اُٹھانے
اُٹھاتے، اُبکائی آئی اور جوں ہی میں نے اُگال دان
سامنے کیا کہ اُس نے ڈالنا شروع کیا جس سے میرے

ہاتھ بھی بھر گئے۔ اگرچہ میں تمام شہر میں اب تک نہایت نازک مزاج مشہور ہوں مگر بخدا کبھی مجھے ہاتھ یا آستین بھرنے سے ایسی کراہت نہیں آئی کہ اس کی محبت پر غالب آکر مجھے اس کی خدمت سے باز رکھتی خدا خدا کر کے یہ زمین دیکھنے گئی تو غشی نے آدبایا۔ جب دیکھو آنکھ بند۔ ایک دن اس نے متواتر ۱۲ گھنٹے آنکھ نہ کھولی اور مجھے از حد تشویش ہوئی۔

رات کو تقریباً ۹ بجے جبکہ اس کا سر میرے زانو پر تھا اُسے ہوش آیا اور چھوٹتے ہی اس نے مجھ سے کہا:۔

"تم اس قدر کیوں تکلیف اُٹھاتے ہو کیوں مجھے شرمندہ کئے جاتے ہو اول تو ماما موجود ہے تمہاری ہر وقت گھر میں رہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اگر خیر تم نہیں مانتے تو خود ہر ایک کام کرنا بھی ٹھیک نہیں میں تمہارے ان احسانات سے کیوں کر سبک دوش ہو سکتی ہوں۔ ایک غریب ماں باپ کی لڑکی کم مایہ، اندھی بیکار، لاچار، خود دوسروں کی محتاج، خدا کے لئے مجھے اس قدر محجوب نہ کرو کہ میں اس شرمندگی سے مر جاؤں اس پر بھی تمہیں ماما کا اعتبار

نہ ہو تو اچھا یہی کرو کہ اپنی شادی کسی سے
کر لو وہ تمام گھر بار کا انتظام خود کر لے
گی اور تمہیں اس قدر زیادہ اور دوسری
نہیں کرنی پڑے گی یہ نہ سمجھنا کہ مجھے سوکن
کا کچھ خیال ہوگا، کبھی نہیں، ہرگز نہیں
بخدا میں تو صرف ایک اسی احسان کا
کہ تم نے میرا سرتاج بننا پسند کیا تمام عمر
کسی طرح بدلہ نہیں دے سکتی اور یہ بھی
سن لو کہ سوکناپے کے یا جیلانے خیالات
اسی وقت آتے ہیں جبکہ ایک دوسری
کی کسی بات پر قبضہ کرنا چاہے۔ مجھے روپیہ
پیسہ حکومت برابری مرتبہ وغیرہ کا
قطعی خیال نہیں ہے اور نہ ہوگا۔ پھر ایسی
حالت میں، میں ایک کونے میں پڑی رہونگی
اور وہیں دو روٹیاں کھاکر تمہاری بہبودی
اور ترقی کی دعا میں بقیہ عمر گذار دوں گی
اسی طرح رہنے سے اسے بھی مجھ سے کسی
قسم کی پرخاش نہیں ہو سکتی۔ جب میں
اسے اور تمہیں ہنستے بولتے سنوں گی تو
بخدا میری طبیعت بے انتہا خوش ہو گی۔
کیونکہ واقعی میرے ساتھ شادی کر کے

تم نے اپنے اوپر ایک بڑا ظلم کیا ہے۔ میں سمجھوں گی کہ خدا نے میرے اوپر مہر بانیوں اور احسانات کا معاوضہ میرے سامنے دیا۔ سچ کہتی ہوں کہ جہاں تک ہو سکے گا میں اس کی طبیعت پر میل تک نہ آنے دوں گی۔"

کچھ نہ پوچھئے کہ ان الفاظ نے میرے ساتھ کیا کیا؟ میرے خون میں چکر آیا۔ آنکھوں اور کانوں سے دھواں نکلنے لگا اور میں نے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔ حالت روز بروز خراب ہوتی گئی اور چونکہ قاضی صاحب بھی اس عرصہ میں دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے تھے اس نے ایک دن اپنی والدہ کو بلایا اور ان کے اور میرے سامنے نہایت درد بھرے الفاظ کے ساتھ مہر معاف کر دیا۔ ادھر میں روتے روتے بیہوش ہو گیا۔ اسی دن سے اسے ہچکی لگ گئی اور پانچ روز تک ہچکیوں میں مبتلا رہی۔ پانچویں دن صبح کو اس نے نہایت رک رک کر نا معلوم مجھے کیا کیا کہا مگر آواز کی کمی اور ہچکیوں کے تار نے قطعی نہ سننے دیا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ البتہ بڑی کوشش کے بعد یہ جملہ سمجھ میں آیا:۔

"اگر تمہیں تکلیف ہوئی تو میری روح کو صدمہ ہوگا"

اس دن آٹھ گھنٹے برابر میری آنکھوں سے قسم کھانے کو بھی آنسو نہ تھا۔ شام ہوتے ہی وہ نیک اور راستباز نابینا مجھ کم نصیب کو آخری دم تک دعائیں دیتی راہی بقا ہوئی اور میں دنیا کی تکلیفیں اٹھانے کے لئے اکیلا رہ گیا۔

میں نے گھر سے نکلنا قطعی چھوڑ دیا تھا اور ہر وقت تنہائی میں اس کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو رو دیا کرتا۔

راقم (ا۔ ح)

اس صبر کا اجر یہ ملا کہ ا۔ح کی شادی اس واقعہ کے ایک سال بعد ریاست کے ایک معزز عہدہ دار کی لڑکی سے ہو گئی اور وہ زیادہ تر ا۔ح کی کہانی ہی سن کر متاثر ہوئے۔ اب انہوں نے اڑھائی سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کی جائداد۔ ا۔ح کے نام کر دی ہے اور لڑکی جس سے شادی ہوئی ہے پڑھی لکھی۔ باہنر حسن و وفا کی پتلی ہے۔ یہ اجر دنیا میں ملا۔ اور آخرت کا حساب کون لگا سکتا ہے۔

(مخزن ادب)

# مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

از

(سیّد سجّاد حیدر بی اے)

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

ایک دن میں دِلی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک فقیر پر پڑی جو بڑے مؤثر طریقے سے اپنی حالتِ زار لوگوں سے بیان کرتا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ کے وقفے کے بعد یہ درد سے بھری اسپیچ انہیں الفاظ اسی پیرائے میں دُہرا دی جاتی تھی۔ یہ طرز کچھ مجھے ایسا خاص معلوم ہوا کہ میں اس شخص کو دیکھنے اور اس کے الفاظ سُننے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس فقیر کا قد لمبا جسم خوب موٹا تازہ تھا۔ اور چہرہ ایک حد تک خوبصورت تھا مگر بدمعاشی اور بے حیائی نے صورت مسخ کر دی تھی' یہ تو اس کی شکل تھی۔ رہی اس کی صدا، تو میں ایسا قصی القلب نہیں ہوں کہ صرف اس کا مختصر سا خلاصہ لکھ دوں۔ وہ

اس قابل ہے کہ لفظ بلفظ لکھی جائے چنانچہ وہ اسپیچ یا صدا جو کچھ کہئے یہ تھی :-

"اے بھائی مسلمانو! خدا کے لئے مجھ بدنصیب کا حال سنو۔ میں آفت کا مارا سات بچوں کا باپ ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا ہوں اب روٹیوں کا محتاج ہوں اور اپنی مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں میں بھیک نہیں مانگتا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤں مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔ بھائی مسلمانو! میں غریب الوطن ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں، اے خدا کے بندو! میری سنو! میں غریب الوطن ہوں"۔

فقیر تو یہ کہتا ہوا، اور جن پر اس کے قصے کا اثر ہوا اُن کی خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے اور میں نے اپنی حالت کا مقابلہ اس سے کیا۔ اور مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر امور میں میں نے اس کو اچھا پایا۔ یہ صحیح ہے کہ میں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا ہے نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں وہ پھٹے کپڑے پہنتا ہے۔ بس یہاں تک میں اس سے بہتر ہوں۔ آگے بڑھ کر اس کی حالت

مجھ سے بدرجہا اچھی ہے۔ اس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہیئے۔ میں رات دن فکر میں گذارتا ہوں اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے اس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی بڑی دیر تک میں غور کرتا رہا کہ اس کی یہ قابلِ رشک حالت کس وجہ سے ہے؟ اور آخرکار میں بظاہر اس عجیب نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے وہی اس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ "میرا کوئی دوست نہیں" میں حسرت سے کہتا ہوں کہ میرے اتنے دوست ہیں" اس کا کوئی دوست نہیں" اگر یہ سچ ہے تو اُسے مبارکباد دینی چاہیئے۔

میں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہوا مکان پر آیا کیسا خوش قسمت آدمی ہے۔ کہتا ہے "میرا کوئی دوست نہیں" اے خوش نصیب شخص! یہیں تو تُو مجھ سے بڑھ گیا لیکن کیا اس کا یہ قول صحیح بھی ہے؟

صحیح بھی ہے؟ یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں جو میرے دوستوں کی طرح اُسے دن بھر میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے؟ میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جارہا ہوں۔ مگر خبر نہیں کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملے گا کہ میں تخلیہ میں اپنے خیالات جمع کر سکوں۔ اور اُنہیں اطمینان سے قلمبند

کر سکوں، یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے اُسے سوچ سکوں۔ کیا یہ فقیر دن دہاڑے اپنا روپیہ لے جا سکتا ہے؟ اور اس کا کوئی دوست راستے میں نہ ملے گا اور یہ نہ کہے گا:۔

"بھائی جان دیکھو! پرانی دوستی کا واسطہ
دیتا ہوں، مجھے اس وقت ضرورت ہے
تھوڑا سا روپیہ قرض دو"۔

کیا اس کے احباب وقت بے وقت اُسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے؟ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اسے نیند کے جھونکے آرہے ہیں مگر یار دوستوں کا مجمع ہے جو قصے پر قصہ اور لطیفے پر لطیفہ کہہ رہے ہیں اور اُٹھنے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اسے دوستوں کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا۔ کیا اس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں جو اُسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے؟ کیا اسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہو حق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اسے جانا نہیں پڑتا اور اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا؟ اگر ان سب باتوں سے وہ آزاد ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہٹا کٹا ہے۔ اور میں نحیف و زار ہوں۔ یا اللہ! کیا اس بات پر بھی شکر ادا نہیں کرتا؟ خدا جانے وہ اور

کون سی نعمت چاہتا ہے۔

لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بے ہودہ خیالات ہیں! بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہوتی ہے اور یہ ان سے بھاگتا ہے۔ مگر میں دوستوں کو بُرا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لئے میرے پاس آتے ہیں اور میرے خیر طلب ہیں، مگر عملی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے مجھے فائدہ پہنچانے کا، اور ہو جاتا ہے مجھے نقصان۔ چاہے مجھ پر نفرین کی جائے، مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ نہ ثابت کر سکا کہ احباب کا ایک جمّ غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں کچھ کام کرنا ہے اور باتوں ہی باتوں میں عمر نہیں گزارنی ہے تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا؟ چاہے اس سے میرے دل پر کیسا ہی صدمہ ہو۔

مثلاً میرے دوست احمد مرزا ہیں جنھیں میں بھڑ بھڑیا دوست کہتا ہوں، یہ نہایت معقول آدمی ہیں۔ اور میری اُن کی دوستی نہایت پُرانی اور بے تکلفی کی ہے۔ مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا جب آئیں گے شور مچاتے ہوئے۔ چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرضیکہ اُن کا آنا

بھونچال کے آنے سے کم نہیں ہے جب وہ آتے ہیں تو میں کہتا ہوں "کوئی آرہا ہے قیامت نہیں ہے"۔ اُن کے آنے کی مجھے دور سے خبر ہو جاتی ہے۔ باوجودیکہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ چھت پر ہے۔ اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ میاں اس وقت کام میں مشغول ہیں"۔ تو وہ فوراً چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ اکم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو خیال نہیں۔ (نوکر کی طرف مخاطب ہو کر)

"خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے توبہ توبہ! اچھا بس ایک منٹ اُن کے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے خود جانا ہے۔ چھت پر ہونگے نا؟ میں پہلے ہی سمجھتا تھا"۔

یہ کہتے ہوئے وہ اوپر آتے ہیں اور دروازے کو اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولہ آکے لگا۔ (آج تک انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں) اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں۔

"آہاہا! آخر تمہیں میں نے پکڑ لیا۔ مگر دیکھو میری وجہ سے اپنا لکھنا بند مت کرو۔ میں ہرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے؟ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ لو

اب جاتا ہوں۔ میں بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا۔ تمہاری خیریت دریافت کرنی تھی۔ خدا حافظ!"

یہ کہہ کے وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دبا دیتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیحدہ رہا اپنے ساتھ میرے کل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر اب وہ کہاں! اور دیکھا جائے تو میرے کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہے تاہم اگر وہ گھنٹوں رہتے تو اس سے زیادہ نقصان نہ کرتے کیا میں انہیں چھوڑ سکتا ہوں؟ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میری اور اُن کی دوستی بہت پرانی ہے۔ اور مجھ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں تاہم انہیں چھوڑوں گا اگرچہ کلیجے پر پتھر رکھنا پڑے۔

اور لیجئے! دوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ یہ بال بچوں والے صاحب ہیں اور رات دن ان ہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں، جب میں کام سے تو فارغ ہو چکتا ہوں لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک گھنٹے آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں۔ مگر تحسین آئے ہیں اور ان سے ملنا

ضروری ہے۔ اُن کے پاس باتیں کرنے کے لئے سوائے اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں میں کتنی ہی کوشش کروں مگر وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں "ہاں بڑا خراب موسم ہے۔ میرے چھوٹے لڑکے کو بخار آگیا۔ منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے اگر پالی ٹکس یا لڑیچر کے متعلق گفتگو کرتا ہوں تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ بھائی! آج کل گھر بھر بیمار ہے مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔ اگر کسی عام جلسہ میں آتے ہیں تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لئے ہوتے ہیں اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ" طبعیت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں لگتی؟ کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری کا ہی ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں جنھیں سوائے اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے فریق مخالف کی برائیوں اور جج صاحب کی تعریف یا مذمّت کے (تعریف اس حالت میں جبکہ انہوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی مضمون نہیں۔ منجملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے میں شاکرصاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا۔ کیوں کہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں شاکر صاحب موضع سلیم پور کے رئیس

اور ضلع بھر میں نہایت معزز آدمی ہیں۔ انہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں، جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا۔ اُن کا خیال ہے کہ اہل علم کی تھوڑی سی قدر کرنا امرا کے شایانِ شان ہے۔ ایک مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے یہ کہہ کر گئے :۔

"شہر میں رات دن شور و شغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصہ رہنے سے تبدیل آب و ہوا بھی ہوگی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کرسکو گے۔ میں نے ایک کمرہ خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا جس میں پڑھنے لکھنے کا سب سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دن رہ کے چلے آنا دیکھو میری خوشی کرو۔

میں ایسے محبت آمیز اصرار پر انکار کیسے کر سکتا تھا مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لیکر اُن کے ساتھ ہولیا۔ اڈیٹر معارف سے وعدہ کرچکا تھا کہ ایک خاص عرصہ میں اُن کی خدمت میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ شاکر خانصاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے وہ کمرہ دیکھا جو میرے لئے تیار کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل میں تھا اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا، اس کی ایک کھڑکی پائین باغ کی طرف کھلتی تھی اور ایک نہایت ہی دلفریب نیچرل منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو میں

نیچے ناشتے کی غرض سے بلایا گیا۔ جب دوسرا پیالہ چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے میں جانے کے لئے اُٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ "ہائے ہائے کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی سے کام شروع کر دو۔ اپنے دماغ کو کچھ تو آرام دو۔ اور آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے کہ سبزی کا لطف اُٹھانے میں گزارا جائے۔ چلئے گاڑی تیار کراتے ہیں دریا پر مچھلی کا شکار کھیلیں گے۔ پھر وہاں سے دو میل پر احمد نگر ہے۔ آپ کو وہاں کے رئیس راجہ طالب علی صاحب سے ملائیں گے۔

میرا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ اگر یہی حال رہا، تو یہاں بھی فرصت معلوم!

خیر سیکڑوں جیسے حوالوں سے اس وقت تو میں بچ گیا اور میرے میزبان بھی میری وجہ سے نہ گئے مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جس عنقا یعنی یکسوئی کی تلاش میں میں سرگرداں تھا۔ وہ مجھے یہاں بھی نہ ملے گی۔

میں جلدی سے اُٹھ کر اپنے کمرہ میں آیا اور اس وقت ذرا غور سے اس میز کے سامان کو دیکھا جو میرے لکھنے پڑھنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کامدار کپڑا پڑا ہوا تھا۔ جس پر سیاہی کا ایک قطرہ گرانا

گناہِ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ چاندی کی دوات مگر سیاہی دیکھتا ہوں تو سوکھی ہوئی انگریزی قلم نہایت قیمتی اور نایاب مگر اکثر میں نب ندارد۔ جاذب کاغذ ایک مخملی جلد کی کتاب میں مگر لکھنے کے کاغذ کا پتہ نہیں۔

اسی طرح بہت سا اعلیٰ درجہ کا بیش قیمت سامان میز پر تھا۔ مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں اور جو چیزیں کہ ضرورت کی تھیں وہ موجود نہیں آخرکار میں نے اپنا وہی پرانا استعمالی مگر مفید بکس اور اپنی معمولی دوات اور قلم (جس نے اب تک نہایت ایمانداری سے میری مدد کی تھی اور میرے پُر از خیالات کو تیزی کے ساتھ قفس کاغذ میں بند کیا تھا) نکالا اور لکھنا شروع کیا۔ یہ ضرور ہے کہ جن مرغانِ خوش نوا کی تعریف میں شعرا اس قدر رطب اللسان ہیں۔ ان کی اس عنایت سے میں خوش نہیں ہوں کہ سب کے سب میرے کمرے کے نیچے درخت پر جمع ہو گئے اور شور مچانا شروع کر دیا۔ تاہم میں نے کوشش کر کے اُن کی طرف سے کان بند کرلئے اور کام میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔

تن۔ تن تن۔ تنتنا۔ چھن۔ تا تن۔ تن تن تن، میں ایسا مصروف تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی یکایک اس تن تن نے چونکا دیا۔

ہیں! یہ کیا ہے؟ افوہ! اب میں سمجھا۔ میرے
کمرے کے قریب شاکر خاں صاحب کے چھوٹے بھائی
کا کمرہ ہے انہیں موسیقی میں بہت دخل ہے۔ اس
وقت ستار سے شوق فرما رہے ہیں۔ بہت خوب بجا
رہے ہیں۔

"اس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہت زلف لائے
کیوں؟ مجھ کو صبا سے ہے اُمید۔ آہا! مجھ کو صبا سے
ہے اُمید۔ مجھ سے صبا کو کیا غرض"

واہ وا! سبحان اللہ! کیا غزل چھیڑی ہے! "اے
ترک سوار! نواح عرب یثرب نگر کی پہنچا دینا۔ کس
رنگ میں ہے وہ حبیب مرا، مجھے واکی کھبر یا لا دینا"
بہت ہی خوب کمال کرتے ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹے اُنہوں نے موسیقی کی مشق فرما کر
مجھے میری خواہش کے خلاف محظوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ
سے وہ اپنے کمرے سے چلے گئے اور خاموشی طاری
ہو گئی تو مجھے پھر اپنے کام کا خیال آیا۔

"اے میرے خیالات! تمہیں میرا گنجینہ، میرا خزانہ
ہو خدا کے لئے رحم کرو۔ میرے دماغ میں پھر آؤ"
یہ کہہ کے میں کاغذ کی طرف متوجہ ہوا کہ دیکھوں کہاں
چھوڑا ہے۔ میں اس فقرے تک پہنچا تھا "ہم اس پیچ
اور دقیق مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں اتنا ہی

اس کی مشکلات کا مثل.........."
مثل کے آگے بس کیا لکھنے والا تھا؟ ریگ دریا کے اندازہ نہیں کر سکتے؟ ہر گز نہیں۔ ایسا معمولی فقرہ تو نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ اور تھا کوئی اعلیٰ درجے کی تشبیہہ تھی اور فقرے کو نہایت شاندار الفاظ میں ختم کرنے والا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا تھا کیا نہ تھا اب تو دماغ میں اس کا پتہ بھی نہیں۔ گانے والے صاحب تو شکایت کر رہے تھے کہ:۔

"اس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہتِ زلف لائے کیوں؟ مجھ کو صبا سے ہے اُمید، مجھ سے صبا کو کیا غرض"

مگر میرا تو صبا کے نام نے دماغ خالی کر دیا۔ اگر وہ آدمی اور نکہتِ زلف بھی لاتی، تو نہ معلوم کیا ہوتا بہر حال مجھے وہ فقرہ از سر نو درست کرنا چاہئے۔ مشکلات کے بجائے کچھ اور ہونا چاہئے۔

"ہم اس وسیع مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں اتنا ہی اُن بیش بہا علمی جواہر کو جو ہمارے ملک اور قوم کے علمی خزانے کے پُر کرنے کے لئے کافی ہیں اور جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے؟ اتنے دنوں کہاں رہے؟"

جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے اتنے دنوں

کہاں رہے ؟" یہ کیا مہمل فقرہ ہوا! لاحول ولا قوۃ میں بھی کیا گڑبڑ کر رہا ہوں۔ آپ کہاں بھول پڑے اتنے دنوں کہاں رہے ؟"

یہ فقرے تو شاکر خاں صاحب نے کسی دوست سے کہے ہیں جو ابھی اُن سے ملنے آیا ہے۔ میں مصروفیت میں انہیں ہی لکھ گیا۔

"ہاں تو کاٹ کے فقرہ درست کرنا چاہیے! اور جن کی قدر ابھی تک ملک و قوم کو نہیں ہوئی اور بظاہر" کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

"کون ہے"

"میں ہوں شبن۔ سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو نیچے ذرا سی دیر کے لئے تشریف لائیے کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں اور سرکار انہیں آپ سے ملانا چاہتے ہیں"

بادل ناخواستہ میں اُٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر صاحب کے دوست راجہ طالب علی صاحب تشریف لائے تھے ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شبن نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی۔ ہمارے میزبان کے کوئی اور

دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤنگا گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کر دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پاکر اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے۔ فقرہ از سر نو پھر بنانا پڑا۔ طبیعت اُچاٹ ہو گئی بہ ہزار دقت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا، اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ اور میں لکھ رہا تھا۔

ہم کو کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کے قابل نوجوان جنہیں تفتیش اور تحقیق کا شوق ہے اور جو کولمبس کی طرح نئی معلومات اور نئی دُنیا (گو وہ علمی دنیا ہی کیوں نہ ہو) کے دریافت کرنے کے لئے اپنے تئیں،،

"دروازہ پر پھر دستک" کیا ہے؟ اچھا،،

"دریافت کرنے کے لئے اپنے تئیں خطرے میں ڈالنے سے بھی خوف نہیں کھاتے ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے اور اپنی کاوشوں اور کوششوں سے موجودہ.....،،

دروازہ پھر کھٹ کھٹایا گیا۔

"ہاں،،

"حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کھانا

ٹھنڈا ہوا جاتا ہے،،

"افوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا میرا انتظار نہ فرمائیں میں پھر کھا لوں گا۔ اس وقت مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں،،

"اور آئندہ نسلوں کو زیر بار احسان کریں گے یہی وہ نوجوان ہیں جو قوم کی کشتی کو خدا کی مدد پر بھروسہ کر کے خطرات سے بچانے اور ساحلِ مراد تک پہنچانے ہیں زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ............،،

دستک "کیا ہے؟،،

"سرکار کہتے ہیں اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائیں گے تو ہم بھی اسی وقت کھائیں گے۔ مگر کھانا ٹھنڈا ہو کے بالکل خراب ہو جائے گا،،

"اچھا بھائی، لو ابھی آیا،،

یہ کہہ کر میں کھانے کے لئے جاتا ہوں سب سے معذرت کرتا ہوں۔ میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں:۔

"چہرے پر تھکن معلوم ہوتی ہے۔ کیا بہت لکھ ڈالا دیکھو میں تم سے کہتا تھا نا کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں،،

سوائے اس کے کہ آمنا و صدقنا کہوں، اور کیا کہہ سکتا تھا۔ اب کھانے پر اصرار ہوتا ہے جس چیز سے

مجھے رغبت نہیں، وہی کھلائی جاتی ہے۔ بعد کھانے کے میزبان صاحب فرماتے ہیں:۔
"سہ پہر کو تمہیں گاڑی میں چلنا ہوگا میں تمہیں اس واسطے یہاں نہیں لایا کہ سخت دماغی کام کرکے اپنی صحت خراب کر لو"
واپس کمرے میں آکر میں تھوڑی دیر اس غرض سے لیٹتا ہوں کہ خیالات جمع کر لوں اور پھر لکھنا شروع کر دوں۔ مگر اب خیالات کہاں۔ مضمون اٹھا کر دیکھتا ہوں:۔

"زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ"

اس کے متعلق کیا لکھنے والا تھا؟ ان الفاظ کے بعد کون سے الفاظ دماغ میں تھے؟ اب کچھ خیال نہیں کہ اسکو پہلے فقرے سے کیونکر ربط پیدا کرنا تھا۔ یوں ہی پڑے پڑے نیند آجاتی ہے۔ تیسرے پہر اٹھتا ہوں تو دماغ نہایت صحیح پاتا ہوں۔
"زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ" بالکل حل ہوجاتا ہے۔ پورا فقرہ آئینے کی طرح نظر آتا ہے۔ میں خوشی خوشی اٹھ کر میز پر آگیا۔ اور لکھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک!
نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے سرکار کپڑے پہنے آپ کا انتظار کر رہے ہیں فوراً پہنچ جاتا

ہوں تو پہلا فقرہ جو میز بان صاحب فرماتے ہیں یہ ہوتا ہے :-

"آج تو دستے کے دستے لکھ ڈالے" ہیں سچی بات کہوں کہ کچھ بھی نہیں لکھا" تو وہ ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ " آخر اس قدر کسرِ نفسی کی کیا ضرورت ہے

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھایئے قسمیں
مجھے یقین ہوا مجھ کو اعتبار آیا

مل ملا کر شام کو واپس آئے کھانے کے بعد باتیں ہوتی ہیں۔ سونے کے وقت اپنا دن بھر کا کام اُٹھا کر دیکھتا ہوں تو ایک صفحے سے زیادہ نہیں وہ بھی بے ربط و بے سلسلہ۔ غصے اور رنج میں آکر اسے پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں اور دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے اپنے گھر واپس چلا آتا ہوں۔ میں ناشکر گزار اور احسان فراموش کہا جاؤں گا مگر میں مجبور ہوں۔ اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ دوں گا۔

میں نے ذرا تفصیل سے اُن کا حال بیان کیا ہے مگر یہ خیال نہ کرنا کہ یہیں ان احباب کی فہرست ہو گئی جن سے میں رخصت طلب کر سکتا ہوں۔

نہیں ابھی بہت سے باقی ہیں مثلاً ایک صاحب ہیں جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے۔ مگر جب آتے

ہیں میں ان کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لئے آتے ہیں۔

ایک صاحب ہیں جو ہمیشہ ایسے وقت آتے ہیں جب میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں جب مجھ سے ملتے ہیں کہتے ہیں:۔

"میاں عرصہ سے میرا دل چاہتا ہے تمہاری دعوت کروں" مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست آتے ہیں وہ آتے ہی سوالات کی بوچھار کر دیتے ہیں۔ جب میں جواب دیتا ہوں تو متوجہ ہوکر نہیں سنتے۔ یا اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں یا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں وہ جب آتے ہیں اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔ میری نہیں سنتے۔

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں ع

"مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"

اب چونکہ میں نے یہ حال لکھنا شروع کر دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اور احباب کے متعلق اپنے دلی خیالات ظاہر کروں، دروازے پر ایک گاڑی آکے رُکی ہے میں سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا۔ کون صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان کی شکایت نہیں کرنے کا

کیونکہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ تین گھنٹے سے میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ کسی کرم فرما نے کرم نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ اس کے شکریہ میں میں اس مضمون کو اسی ناتمام حالت میں چھوڑتا ہوں اور اپنے دوست کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ دوست میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جب آتے ہیں مجھ پر اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں کہ "تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے،، میں جانتا ہوں کہ اسوقت بھی یہ کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا حال سنائیں گے جو بڑا حاذق ہے۔ یا کوئی مجرب نسخہ میرے لئے کسی سے مانگ کر لائے ہوں گے۔

آیئے آیئے۔ مزاج عالی بہت دن بعد تشریف لائے۔

(خیالستان)

# عرب شہید کا گھر

از

## خواجہ حسن نظامی

طرابلسی عرب کے گھر کو دیکھو۔ غمگین ماں اپنے دو جوان بیٹوں کی لاشوں کے بیچ میں کلیجہ تھامے کھڑی ہے ان کو اٹلی کے کافروں نے سنگینوں سے، کرچوں سے کچوکے دے دے کر مارا ہے۔ لوگ ابھی اُن کی لاشوں کو گھر میں لائے ہیں، ماں پوچھتی ہے :۔ کیا یوں ہی مرگئے یا کچھ ہاتھ دکھاکر کام آئے؟ کہا جاتا ہے کہ نہیں خوب گھمسان لڑائی لڑی، بیسیوں کو جہنم رسید کیا۔

لو ایک جنازہ اور آیا۔ یہ اس خاتون کا خاوند ہے، شہیدوں کا باپ ہے۔ مرا نہیں زخمی ہوا ہے۔ خون بہ رہا ہے۔ سانس اُکھڑ رہا ہے، ہونٹ خشک ہیں چہرہ زرد ہوتا جارہا ہے مگر تیوری کا بل نہیں گیا پستول ہاتھ سے جدا نہیں ہوا۔

خاتون دوڑی، اپنے سرتاج کو سہارا دے کر

بیٹھ گئی۔ چھوٹی لڑکی پانی لائی، بڑی نے زخم دھونا شروع کیا۔ خون اُبلا چلا آتا ہے نہیں رُکتا۔ عرب کا بارہ برس کا چھوٹا لڑکا بیمار ہے۔ بخار میں بے ہوش تھا ابھی آنکھ کھولی، باپ اور بھائیوں کی کیفیت دیکھ کر از خود رفتہ ہوکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ باپ دم توڑنے لگا اور بولا جاؤ بیٹا جاؤ نور چشم میدان کو سدھارو، گولی مارو اور گولی کھاؤ۔ تم میرے گھر کی آخری شمع ہو۔ اِن لاوارث عورتوں کا سہارا ہو۔ مگر میں اپنے گھر کی شمع بجھانے کو تیار ہوں۔ آگے بڑھو اور دین کی شمع کو بچاؤ اِن بے کس عورتوں کا وارث خدا ہے۔ چھوڑ دو بے فکر ہوکر مرنے جاؤ۔

میں مرتا ہوں فرشتے میری رُوح لینے آئے ہیں ذرا دم لو۔ اپنے لاڈلے کو کارتوس کی پیٹی باندھتے دیکھ لوں۔ مجھے اس کی شادی کی تمنا تھی، نکاح کی قبا پہنانی چاہتا تھا، لیکن آج خوش نصیبی سے عبائے شہادت میسر آگئی ہے، دیکھوں اس کے ننھے سے نازک جسم پر کیسی معلوم ہوتی ہے۔ بیوی بانو میرے پاس سے ہٹ جاؤ! اپنے لختِ جگر کو دولھا بناؤ تلوار باندھو، کارتوسوں کا ہار گلے میں ڈالو۔ اور کہو جا بیٹا! دین پر قربان ہو جا۔ ہم عرب ہیں، مسلم ہیں جان دینا اور جان لینا ہماری شادی ہے۔ دیکھو بیٹا یہ قرآن ہے اس کی لاج رکھیو،

اس کی آبرو پر کٹ کر مرجائیو، دشمن اس کو زیر کرنے آئے ہیں۔ تو بڑھ کر ان کو زیر و زبر کر دیجیو۔ بیچے قرآن ہماری جان ہے، ایمان ہے، عزت ہے، آبرو ہے، کفار اس پر غلبہ نہ پائیں۔ تو اکیلا نہیں ہے۔ دنیا کے مسلمان تیری کمک کو دوڑے چلے آتے ہیں۔

امی! مجھے رخصت۔ ایسا نہ ہو اور مسلمان پہلے پہنچ جائیں اور میں شہادت سے محروم رہ جاؤں۔

بیٹا! تو کہاں چلا۔ مجھے کس پر چھوڑا۔ ان تینوں لاشوں کو کون دفنائے گا؟ کافر ہم عورتوں کو لونڈی بنالیں گے تو ہمیں کون بچائے گا؟ ارے تیری ان جوان بہنوں کے ناموس کا کیا حشر ہوگا۔ ارے تو ابھی رن میں گولی چلانے کے قابل نہیں، ابھی عمر ہی کیا ہے؟

نہیں بی مجھے جانے دو۔ تمہارے وارث دنیا کے مسلمان ہیں اور ان مسلمانوں کا خدا ہے۔ مت سمجھو کہ میرے بھائی مر گئے۔ باپ جان سے گزر گیا میں بھی موت کے منہ میں جاتا ہوں تو تم لاوارث ہو جاؤ گی نہیں عرب کے، مصر کے، ایران کے، ہندوستان کے، سارے جہان کے مسلمان تم پر اپنا جان و مال نثار کر دیں گے" گھبراؤ نہیں اماں مجھے جانے دو"

لوگو! میری کھیتی برباد ہو رہی ہے، اولاد والو! میری اولاد کا باغ اجڑا جاتا ہے۔ ارے میرا کلیجہ نکلا پڑتا ہے۔

مسلمانو! ذرا دیکھو! میری مصیبت پر ماتم کرو
میری دو کڑیاں ٹوٹ گئیں، زندگی کا ساتھی بچھڑ گیا
یہ کونپل بھی جدا ہوئی ہے۔ میری خوشی کی دُنیا کا سورج
غروب ہوتا ہے۔ تم کو کھانا زہر کیوں نہیں معلوم ہوتا
خوشی و خرمی سے کس لئے بیزار نہیں ہوتے۔ نیند کا
مزہ کس واسطے باقی ہے۔ ہائے میرا گھر تو لٹے اور تم
ٹس سے مس نہ ہو۔ مومن ہو، بھائی ہو کلمہ کے شریک
ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہو آؤ پرسا
دو کہ میں لٹ گئی آؤ ان بے کسوں کو اول منزل
پہنچاؤ۔ یا اللہ اب کیا ہوگا؟ کیا ہم سے صلیب کے
آگے سجدہ کرایا جائے گا۔ کیا میری ان معصوم
کنواری لڑکیوں کو اٹلی کے وحشی بے ستر کریں گے
مسلمانو! فریاد ہے! دہائی ہے! دین کی لاج
کو اُٹھو۔ عرب کی غیرت کو بچاؤ۔

شریف بانو صبر کر۔ دل کو سنبھال۔ ہم جانتے
ہیں کہ آج طرابلس میں تجھ جیسے ہزاروں گھروں میں
بھی کہرام مچا ہوا ہے۔ لیکن گھبرا مت۔ غیرت خداوندی
ظاہر ہونا چاہتی ہے اور لے سب سے پہلے اپنے ہندی
مسلمان بھائیوں کا ہدیہ اس سے کپڑے بنا۔ روٹی
کھا زخمیوں کی خبر گیری کر ہندی بھائیو! تو کیا اب بھی تم
مجروحوں کے لئے چندہ نہ کروگے۔

# میر کی کہانی
# خود انکی تصانیف کی زبانی

از

پروفیسر نجیب اشرف ندوی

میر کی شاعرانہ عظمت و بزرگی اور بزمِ سخن میں انکی سیادت و میری کا تذکرہ تحصیلِ حاصل اور محدود اور قیمتی وقت کی بربادی ہے خود ان کے قول کے مطابق :-

ریختہ رتبے کو پہنچا یا ہوا اُس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

مگر جس چیز کا افسوس ہے وہ یہ ہے کہ عام تذکروں کے علاوہ چند ہی اصحاب نے میر کی طرف توجہ کی ہے۔ حالانکہ لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہوں کے آئمۂ شعر یعنی امام بخش ناسخ اور اسد اللہ خاں غالب نے ان کے کمال کا اعتراف کیا اور عقیدت کے پھول چڑھائے

ہیں ؎

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

اس لئے اگر میں اپنی محدود استعداد بھر "اُن کی زندگی کے حالات اور اُن کا اثر ان کی شاعری پر" کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ہمت کروں تو شاید بے موقع نہ ہوگا۔

اگر یہ سچ ہے کہ تاریخ و ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے تو آپ کو یہ سن کر بھی متعجب نہیں ہونا چاہیے کہ جس طرح مغل دارالسلطنت، اس کا حکمران، اسکے وزراء، امراء بابر و ہمایوں اور اکبر و جہانگیر کی بنائی ہوئی راج دھانی سے منتقل ہو کر شاہ جہاں آباد دہلی کو آئے۔ اسی طرح اردو کے تقریباً وہ تمام شعراء جن پر اس کو ناز ہے اکبر آباد ہی کی خاک سے پیدا ہوئے۔ شاہ مبارک آرزوؔ۔ شیخ شرف الدین مضمونؔ اور سراج الدین علی خاں آرزوؔ حضرت مظہر جان جاناں اور سب سے آخر میں نظیرؔ و غالبؔ کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے موضوع کے ہیرو کا مولد بھی یہی گہوارۂ ادب و تمدن ارض تاج اکبر آباد ہی ہے

**خاندان**

اِسی سلسلہ میں یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ان کا خاندان حجاز سے

دکن آیا اور ان کے بزرگوں نے گجرات کے دارالسلطنت احمد آباد کو اپنا وطن بنایا۔ پھر اُن کے پر دادا احمد آباد سے اکبر آباد آئے اور یہاں مضافات شہر کے فوجدار مقرر ہوئے ان کے دو لڑکے ہوئے بڑے پاگل ہوکر جوان مرے اور دوسرے ہمارے میر صاحب کے دادا۔

میر صاحب کے والد اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے انہوں نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی خانؔ آرزو کی بہن سے جس سے ایک لڑکا محمد حسن اور دوسری شادی سے تین اولاد۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی بڑے صاحبزادے ہمارے میر صاحب یعنی محمد تقی اور دوسرے محمد رضی

میرؔ صاحب کی بہن دہلی کے شاعر محمد حسین کلیم سے بیاہی گئیں۔ اسی طرح خود میر صاحب کی تین اولاد۔ بڑے صاحبزادے میر عسکری عرف کلو عرشؔ اور دوسرے میر فیض علی خاں فیضؔ۔ "تذکرۃ الخواتین کے مصنف لے ان کی تیسری اولاد یعنی صاحبزادی کا بھی شاعرہ ہونا بتایا ہے اور لکھا ہے کہ بیگم تخلص کرتی تھیں۔

---

لے آزاد نے اسکے بالکل بالعکس لکھا ہے۔ یعنی یہ کہ میر صاحب پہلی بیوی سے تھے اور انکی والدہ کے انتقال کے بعد انکے والد نے آرزو کی ہمشیرہ سے شادی کی تھی لیکن ذکرِ میرؔ سے اس کی تردید ہوسکتی ہے۔ اسی طرح سر شاہ سلیمان نے آرزو کو بعض جگہ نہ معلوم کیوں میرؔ کا خالو بنا دیا۔

**پیدائش** میر کی پیدائش کا سن کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا ہے۔

اور اگرچہ ان کی وفات کا سن معلوم ہے کیونکہ ناسخ نے اسکی تاریخ کہی تھی۔ پھر بھی اول الذکر کی غیر موجودگی کی وجہ سے مختلف تذکرہ نگاروں نے ان کی عمر کے تخمینہ میں ظن و قیاس سے کام لیا ہے۔ آزاد نے سو برس بتائی ہے مولوی عبد الحق کا بھی یہی اندازہ ہے۔ مصحفی کے بیان کے مطابق ۹۶ اور جہان کی روایت کے مطابق ۸۰۔ لیکن اس گتھی کو بھی "ذکر میر" نے سلجھا دیا ہے۔ اس وقت تک ذکر میر کے تین نسخے ملے ہیں ان میں سے دو وہ ہیں جو لکھنؤ آنے سے دس سال پہلے کے لکھے ہوئے تذکرے کی نقل ہیں اور ایک جو انجمن ترقی اردو نے شایع کیا ہے جس سے دہلی کے آخری دس سال کے حالات ہیں بلکہ لکھنؤ کے بعض واقعات کا بھی تذکرہ ہے۔

بہرحال تمام حالات پر تحقیقی نظر ڈالنے پر ہم جس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ تذکرہ اوّل مرتبہ جب مرتب ہوا تو میر صاحب نے اس کی یہ تاریخ کہی:۔

مسمیٰ باسم شد اے باہنر  کہ اس نسخہ گردد بعالم سمر
زتاریخ آگہ شوی بیگماں  فزای دہ و شش عدد گر ابر

اس طرح اگر ذکر میر کے اعداد ۱۱۷۰ میں ہم ۱۶ کا عدد اضافہ کریں تو ۱۱۸۶ ہوتا ہے اور میر صاحب نے اپنے حالات میں

لکھا ہے کہ "پیری رسید یعنی عمر بہ پنجاہ کشید" پس اگر ۱۱۸۶ میں سے ۵۰ گھٹائیں تو ۱۱۳۶ نکلتا ہے۔ مولوی عبد الحق صاحب نے تیسرے نسخے کی بنا پر ۱۱۳۷ء نکالا ہے۔ لیکن واقعات و حالات جن کو میں طوالت کے خیال سے نظر انداز کرتا ہوں ۱۱۳۶ء کے حق میں ہیں۔

**ذات** آزاد نے غلام حسین شورش کے تذکرہ کے حوالہ سے لکھا ہے :۔

"خطاب سیادت انہیں شاعری کی درگاہ سے عطا ہوا" اور اس کے بعد اپنے دستور کے مطابق گرمی بیان کے لئے تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ جب انہوں نے میر تخلص اختیار کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے۔ اس وقت انہوں نے خیال نہ کیا۔ رفتہ رفتہ ہو ہی گئے"۔

سودا کا قطعہ بھی سن رسیدہ لوگوں سے سنا ہے مگر کلیات میں نہیں شاید اس میں بھی اشارہ ہو۔

بیٹھے تنورِ طبع کو جب گرم کر کے میر
کچھ شیر مال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

اخیر میں کہتے ہیں :۔

میری کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد
بٹیا تو گندنا ہے اور آپ کو تھے میر

افسوس ہے کہ مجھے بمبئی میں تذکرہ شورش نہ مل سکا اس لئے اول الذکر بیان کی تصدیق ممکن نہیں۔ البتہ موخر الذکر دونوں بیان بالکل بے بنیاد اور حقیقت سے دور ہیں، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ میر کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جبکہ میر کا سن دس گیارہ سال کا تھا اور انہوں نے شاعری اس کے کم از کم دس سال بعد اپنے استاد کے کہنے سے شروع کی اس لئے ان کے والد کی یہ تنبیہہ تاریخی حیثیت سے بالکل غلط ہے۔

رہا سودا کا قطعہ اس کا خود ان کے کلیات میں پتہ نہیں اور نہ کسی دوسرے تذکرہ نویس نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر ہم خود میر کے اثباتی بیانات کو اس سلبی دلیل کے ساتھ ملائیں تو ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ یقینی سید تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے والد کا نام میر محمد علی لکھا ہے دوسرے وہ خود اپنے کو ہر جگہ میر محمد تقی لکھتے ہیں۔ اسکے علاوہ اپنے اشعار میں بھی انہوں نے اس کا اظہار کیا ہے

(۱) پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

(۲) سجدہ کریں سُن کر اوباش سارے اسکو
سید پسر وہ پیارا ہے گا امام یاں کا

(۳) اے غیرا میر تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے

سیّد نہ ہو وے پھر تو کوئی چمار ہووے
(۴) منکر نہیں ہے کوئی سیادت کا میر کی
ذاتِ مقدس ان کی یہی ذات ہو تو ہو

کیا ان اشعار کی موجودگی میں کوئی بھی اس ذات مقدس کی سیادت سے انکار کر سکتا ہے۔

## تربیت و تعلیم

میر صاحب جس خاندان اور جس فضا و ماحول میں پیدا ہوئے تھے اس کا تقاضا یہ تھا کہ ان کی تربیت و تعلیم دونوں بہترین طریقہ سے ہو۔ لیکن افسوس کہ ایسے لائق باپ اور شفیق منہ بولے چچا نے ایک ہی ساتھ داغ جدائی دیا۔ میر صاحب کو ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی ان کے والد نے اپنے ایک بڑے معتقد و مرید سید امان اللہ کے سپرد کر دیا۔ میر صاحب ان کو عم بزرگوار کے نام سے یاد کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ ان کو اس قدر عزیز رکھتے اور یہ ان سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ ایک لمحہ کی مفارقت گوارا نہ تھی۔ میر صاحب انہیں کے ساتھ رہتے، کھاتے پیتے اور سوتے، جب کبھی وہ کسی بزرگ درویش سے ملنے کو جاتے تو ان کو ضرور ساتھ لے جاتے اور یہ اُن صحبتوں سے مستفید ہوتے لیکن افسوس کہ یہ سایہ عموی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا اور میر صاحب کے والد بھی ان کی تربیت و

تلقین سے ناواقف نہیں رہے اور انہوں نے اپنے صوفیانہ مسلک کے اعتبار سے ان کو جو تعلیم دی وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے اور در اصل یہی وہ بیج تھا جو طفلی میں میرؔ کے زمینِ سینہ میں بویا گیا تھا اور جسے مصائب کے آب گریہ نے آبیاری کی اور جس کے برگ و بار ان کے چمن دیوان میں نظر آتے ہیں۔

"اے پسر عشق نواز، عشق است کہ دریں کار خانہ متصرف است اگر عشق نمی بود نظم کل صورت نمی بست۔ عشق بسوزد۔ بے عشق زندگانی وبال است دل باختۂ عشق بودن کمال است۔ عشق بسازد۔ عشق بسوزد در عالم ہرچہ ہست ظہور عشق است۔ بے عشق نباید بود بے عشق نباید زیست۔ پیغمبر کنعانی عشقِ بہ پسری دارد"

اس یعقوب وار نصیحت نے یوسف سے پسر پر وہ اثر کیا جس کا نتیجہ ان کی عشق کی مثنویاں ہیں مگر افسوس کہ چچا کے غم میں ایک سال کے اندر ہی ان کے والد نے بھی ان کو داغ یتیمی دیا۔ اگر پہلا داغ جگر تھا تو اس داغ دگر نے تو ان کو کہیں کا نہ رکھا۔ دس سال کا سن باپ کا یکایک سر پر سے سایہ اُٹھ جانا اتنا ہی نہیں بلکہ اس پر غضب تو یہ ہوا کہ ان کے بڑے سوتیلے بھائی نے جن کا

فرض تھا کہ وہ اِن بچوں کو اپنی آغوش محبت میں لے کر ان کا غم غلط کرتے وہ سنگدلی دکھائی اور اس ناخلفی کا ثبوت دیا کہ دیکھنے والے کو عبرت ہوتی ہے۔ باپ کی لاش ابھی گھر میں رکھی ہے کہ قرض دہندوں کا مطالبہ شروع ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ برادر بزرگوار ادائیگی قرض کی کوئی سبیل نکالتے اور باپ کی میت کو عزت و احترام سے سپرد خاک کرتے انہوں نے انتہائی شقاوت سے کام لے کر ادائیگی قرض وغیرہ کی ذمہ داری سے انکار کر دیا۔ اس جواب صاف کے بعد ان لوگوں نے بےچارے یازدہ سالہ میر کی طرف توجہ کی یہ معصوم جان کیا سمجھے روتا روتا کبھی گھر میں جاتا اور کبھی باہر آتا بالآخر امان اللہ کے ایک معتقد کو رحم آیا اور اس نے قرض ادا کیا۔ تب جاکر کہیں تجہیز و تکفین کا سامان ہوا۔

جس گھر کی یہ حالت ہو اسکی بربادی اور اس کے مکینوں کی بےکسی و بےبسی کا کیا کہنا۔ اس وقت تمام دُنیا ان کی آنکھوں میں اندھیر تھی۔ ہر طرف بےکسی و بےبسی اور افلاس و غربت کے دیو نظر آ رہے تھے۔ مجبوراً ان کو اسی سال تلاش معاش میں وطن کو خیرباد کہنا پڑا اور وہ دہلی روانہ ہوئے۔ وہاں ان کے والد کے احباب و معتقد ابھی تک موجود تھے۔ ان میں امیرالامرا، اور صمصام الدولہ بھی تھے۔ اُن کے بھتیجے نے ان سے میر کا

تعارف کرایا اور انہوں نے ان کے حال پر رحم کر کے ایک روپیہ روزانہ مقرر کر دیا۔

میر صاحب کمسنی کی وجہ سے وہاں تنہا نہ رہ سکتے تھے اس لئے اکبر آباد واپس آ گئے اور وہیں اپنی ابتدائی تعلیم میں مصروف ہو گئے۔ لیکن یہ وظیفہ بھی زیادہ دنوں تک کے لئے ان کی قسمت میں نہ تھا اس کے چار سال بعد ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور وہاں کے قتل عام میں امیر الامراء بھی شہید ہو گئے۔ ان کی موت میر صاحب کے خاندان کی موت تھی۔ پھر وہی ادبار و افلاس ان کا وظیفہ ہو گیا۔ مجبوراً ان کو دوسری مرتبہ آگرہ کو اس طرح چھوڑنا پڑا کہ جانا نصیب نہ ہوا حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں ان سے اور ان کے بڑے بھائی سے میل ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس مرتبہ جب وہ آئے تو اپنے سوتیلے بھائی کے ماموں سراج الدین علی خاں کے یہاں ٹھہرے۔ لیکن سراج الدین علی خاں کا برتاؤ ان سے اچھا نہ تھا۔ میر کے بڑے بھائی نے ان کو لکھا کہ میر سے خبردار رہنا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میر صاحب کے دل و دماغ پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا اور ان کی حالت جنون تک پہنچ گئی۔ انہوں نے اپنی اس جلاوطنی اور ارکان خاندان کی دشمنی کا اپنے خواب و خیال میں نہایت دردناک پیرایہ میں اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی
در و بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترک وطن پہلے کیوں کر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں
پس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

مگر احباب کی توجہ و کوشش سے ان کو صحت ہو گئی اور اس کے بعد انہوں نے اپنا سلسلۂ تعلیم جاری رکھا
دہلی میں ان کی تعلیم کا طریقہ بھی عجیب و غریب تھا اور وہ ان کے ذوقِ علم کا بہترین مظہر۔ اس غربت میں ان کو کون پڑھاتا اور وہ کس مدرسہ میں جاکر تعلیم پاتے لیکن یہ جنون بھی سر سے دور نہ ہو سکتا تھا۔ مجبوراً خود ہی کتاب لئے سڑک کے کنارے بیٹھے پڑھتے رہتے تا آنکہ حسن اتفاق سے :۔

"روزے بر سر بازار جز کتابے در دست نشستہ بودم، جوانے میر جعفر نام ازاں راہ گذشت، نظرش بر من افتاد و تشریف داد، بعد از ساعتے گفت کہ "اے عزیز دریافتہ میشود کہ ذوق خواندن داری من

من ہم گشتہ کتابم اما مخاطبی نمی یابم، اگر شوق داشتہ باشی چندے می رسیدہ باشم۔ گفتم۔ دستی ندارم کہ خدمتی از من بیاید اگر رنجہ ایں رنج برخود گوارا کنی عین بندہ نوازی است" گفتا ایں قدر ہست کہ تہ پاتا نباشد یا بیروں نمی گذارم۔ گفتم خدائے کریم آسان خواہد کرد،،
اس دن سے وہ ان سے سبق لینے لگے اور
"آں ملک سیرت و آدم صورت دماغ خود می سوخت و مرا چیزے می آموخت،،
لیکن یہ سلسلہ بھی دیر تک قائم نہ رہ سکا اور ایک دن ان کے استاد میر جعفر کے وطن پٹنہ (عظیم آباد) سے خط آیا اور وہ وطن واپس ہو گئے۔

اس کے بعد ان کی ملاقات امروہہ کے ایک سید سعادت علی سے ہوئی اور انہوں نے ان کی طبیعت کا اندازہ دیکھ کر "تکلیف موزوں کردن ریختہ کرد،، میر صاحب نے امتثال امر میں اس فن شریف کو جو آگے چل کر ان کی عظمت و بزرگی کا واحد سبب ہوئے والا تھا اختیار کیا اور چند ہی دنوں میں "مشق خود بمرتبہ رساندم کہ موزونان شہر را مستند شدم، شعر من در تمام شہر دوید و بگوشِ خُرد و بزرگ رسید،، اپنے اشعار میں بھی وہ اس مقبولیت کا اظہار کرتے ہیں۔

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی
گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

اور پھر پیشین گوئی کرتے ہیں

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ

## دہلی کا قیام

میر تقریباً ۴۵ سال دہلی میں رہے اور اپنا لڑکپن جوانی اور بڑھاپا یہیں گزارا۔ ذاتی افلاس و تنگ دستی کے علاوہ دہلی کے روزانہ سیاسی انقلاب اور دائمی غارت گری نے ان کے دل کو بالکل چور کر دیا تھا۔ وہ گوشہ نشین عزلت پسند اور تنہائی دوست ہو گئے۔ والد اور عم بزرگوار کی تعلیم نے ان کو قناعت پیشہ اور توکل اندیشہ پہلے ہی سے بنا دیا تھا۔ اس پر ارباب زمانہ کے طعن و تشنیع کے تیروں نے ان کے سینہ کو چھلنی کر رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دہلی جیسے شہر میں ان کو کہیں بھی پناہ نہیں ملتی تھی۔ ان کا اگر کوئی ماوی و ملجا تھا تو حضرت درد کے والد خواجہ عندلیب کی مرنجان مرنج بزم صافی۔ وہ انہیں کے یہاں اکثر رہا کرتے۔ ان کے یہاں جو مشاعرہ ہوتا اس میں شرکت فرماتے اور پھر درد ہی کی فرمائش سے میر صاحب نے اپنے ہاں بزم مشاعرہ قائم کی اور خود اس کی صدارت کرتے۔ لیکن چہ خورد بامداد فرزندم کا مسئلہ سب سے سخت مسئلہ ہے۔ اور ان کو اس کی بدولت مختلف مسلمان و ہندو امرا و رؤسا کے یہاں ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ اپنی

اس مجبوری کا ایک مخمس میں یوں تذکرہ کرتے ہیں :-

جانا جہاں نہ تھا مجھے سو بار واں گیا
ضعفِ قویٰ سے دست بدیوار واں گیا
محتاج ہو کے ناں کا طلب گار واں گیا
چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا
اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

حاجت مری روا دلِ پر درد نے نہ کی
تاثیر اشکِ سرخ و رخِ زرد نے نہ کی
تدبیر ایک دم بھی دمِ سرد نے نہ کی
دل جوئی حیف میری کسی فرد نے نہ کی
طاقت رہی نہ دل میں گیا جان بے قرار

لیکن اس پر بھی اربابِ زمانہ نے ان کو نہ چھوڑا۔ اور وہ ان کے حملوں سے بلبلا اُٹھے۔

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میرِ بے دماغ
از بس کہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ۱۸۲۰ء میں گوشہ نشین ہو گئے اور نوبت تفرقہ و فاقہ تک پہنچ گئی۔ اس تنگ دستی و غربت کے ساتھ ہی ساتھ دہلی کی حالت نے ان کو اور

مایوس و نا اُمید بنا دیا۔ دہلی کے متعلق لکھتے ہیں :-

(۱) دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

(۲) دھوپ میں جلتی ہیں غریب الوطنوں کی لاشیں
تیرے کوچہ میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا

(۳) زندگانی ہوتی ہے سب پر وبال
کنجڑے جھینکے ہیں روتے ہیں بقال

(۴) پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

عام بے اطمینانی، لکھنؤ کے نئے دربار کی فیاضی اور میر کے ہم عصروں کی وہاں عزت افزائی ایسی چیزیں ہیں جنھوں نے ان کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا کی کہ کیوں نہ وہ بھی ایک مرتبہ کوشش کر دیکھیں اُنکی شہرت اُن سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ سوداؔ کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی جگہ دربار میں خالی تھی۔ سبھوں کی نظر انتخاب میر صاحب پر پڑی اور میر صاحب کو دہلی سے لکھنؤ آنے کی شاہی دعوت دی گئی۔

## دہلی سے لکھنؤ کی آمد

میر نے "میر کی دہلی سے روانگی لکھنؤ میں آمد، سرائے میں قیام اُسی دن مشاعرہ میں خاص انداز و لباس کے

ساتھ شرکت اور فی البدیہہ قطعہ کا پڑھنا اس ڈرامی طریقہ سے بیان کیا کہ پڑھیئے اور مزہ لیجئے مگر افسوس یہ بیان بھی ایک افسانہ اور ان کے جادو رقم کی سحر کاری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اس کے ثبوت میں ہم خود میر صاحب کا بیان پیش کرتے ہیں :-

" فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے ۔ لیکن بے سر و سامانی کی وجہ سے معذور تھا ۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک کے دل میں خیال آیا کہ میر میرے پاس چلا آئے تو اچھا ہو میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں اور نواب اسحاق خاں کے چھوٹے بھائی نجم الدولہ نے کہا کہ اگر نواب صاحب از راہ عنایت کچھ زادِ راہ عنایت فرمائیں تو البتہ میر صاحب آ سکتے ہیں نواب صاحب نے اجازت دی اور انہوں نے سرکار سے زادراہ لے کر مجھے خط لکھا ۔ میں پہلے ہی سے دل برداشتہ بیٹھا تھا ۔ خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا ۔ اول سالار جنگ کے یہاں گیا ۔ بڑی عزت و توقیر سے پیش

آئے اور جو کچھ مناسب تھا بندگان عالی کی جناب میں کہلا بھیجا۔ چار پانچ روز بعد اتفاقاً نواب عالی مرغوں کی لڑائی کے لئے تشریف لائے میں بھی وہاں تھا ملازمت حاصل کی۔ محض فراست سے دریافت فرمایا کہ میر تقی ہو؟ اور نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوئے، اور اپنے ساتھ نشست کے مقام پر لے گئے۔ اپنے شعر مجھے مخاطب کرکے سنائے۔ سبحان اللہ! کلام الملوک ملوک الکلام، اس کے بعد فرط مہربانی سے مجھ سے فرمایش کی۔ اس روز میں نے اپنی غزل کے چند شعر عرض کئے، دو تین روز بعد یاد فرمایا۔ حاضر ہوا اور جو قصیدہ میں نے مدح میں کہا تھا پڑھا۔ سماعت فرمایا اور کمال لطف کے ساتھ اپنے ملازموں کے سلسلہ میں داخل فرمایا۔ اور ہمیشہ میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رہے۔"

**قیام لکھنؤ** اگرچہ میر صاحب دہلی کے دائمی تغیرات اور وہاں کے لوگوں سے گھبرا کر جلا وطنی کے لئے تیار ہو گئے تھے ؎

بس خاک میں ملا نہ کروں کس طرح سفر
مجھ سے غبار رکھتے ہیں اہل وطن تمام

اور اس جلا وطنی سے جیسا کہ ان کا خود بیان ہے کہ ؎

ہوں گرمِ سفر شامِ غریباں سے خوشی ہوں
اے صبحِ وطن تو تو مجھے بے وطنی ہے

پھر بھی وہی دلی جس نے ذوق کو اس کی گلیاں نہ چھوڑنے دیا اور اس کی یاد برابر ان کو تڑپاتی رہی کس حسرت سے فرماتے ہیں:۔

مزہ یہ دہلی کا دو چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

اور کیا ہی یاس انگیز تمنا ہے ؎

بے زری کا نہ کر گلہ غافل
رہ تسلّی کہ یوں مقدر تھا

یہاں اگرچہ نواب آصف الدولہ نے اُن کے تین سو روپے مقرر کر دیئے تھے اور اُن کے بعد نواب سعادت علی خاں نے بھی اُسے جاری رکھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بد نصیبی نے یہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور ان کی یہ تنخواہ شاید ان کو برسوں نہ ملتی تھی۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے یعنی خود اُن کی مایوسانہ فطرت جس نے ان کو دربار کے قابل بھی نہ رکھا تھا اور نہ اُن سے کسی کی مصاحبت جو بھٹی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور انشاء جیسے مزاج ہی کے لوگ جس کے لئے موزوں تھے ہو سکتی تھی۔

"گلشنِ ہند" کا مصنف جو میرؔ کا ہمعصر تھا اور جس نے ان کی سب سے زیادہ تعریف کی ہے لکھتا ہے:۔

"میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں
طلسم ساز ہے خیال کا اور جادو طرازی بیان
میں معانی پرداز ہے مقام کا وہ نان شبینہ
کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں اس کی
پوچھتا آج ہے۔"

اور خود میر صاحب کے ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حیثیت سے وہ غالبؔ سے بھی بدتر تھے کہ اس کی چھ ماہی تو ہو جاتی تھی لیکن یہاں یہ حال تھا کہ برسی کی بھی نوبت نہ آئی تھی۔

(۱) مدت مدید گذری مجھے کرتے انتظار
خجلت ہوئی جو حال لکھا میں نے بار بار

(۲) اس فرد دستخطی کو ہے یہ ماہ ہفتمیں
تنخواہ کا نہیں ہے ٹھکانا ابھی کہیں

(۳) برسوں ہوئے مہینوں کے وعدے ہوئے وعید
سچ کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ان جھوٹوں سے بعید

اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپ ہوگا کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قائم ہوا اور اس کے لئے بقول لطف

"درخواست صاحبان عالی شان کی زبان
دانان ریختہ کے مقدمہ میں کلکتہ سے لکھنؤ کو

گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے روبرو
تقریب میر کی ہوئی۔ لیکن علتِ پیری سے
یہ بےچارے مجہول کے محمول ہوئے اور
جوانان نومشق مربی گری سے قوت بدتی
کے مقبول ہوئے،،

غریب میر کی یہ آخری کوشش تھی اور اس میں بھی ان کی بدقسمتی نے استقلال دکھلایا۔ اس کے بعد انہوں نے انتہائی لاچارگی میں اپنے کو بحر حوادث کے سیلاب کے حوالہ کر دیا۔ اور اسی حالت میں ۱۲۲۵ء میں وفات پائی ناسخ نے ان کی تاریخ اس مصرعہ سے نکالی ہے۔

واویلا مرد شہ شاعراں

میر صاحب کی زندگی کا سرسری مطالعہ بھی یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ ان کی تمام زندگی مصائب و آلام مایوسی و ناکامی حسرت و ناامیدی کی مستقل کتاب تھی۔ ان کا بچپن آفات کی گود میں کٹا۔ جوانی تنگدستی و پریشانی کے سایہ میں بسر ہوئی اور بڑھاپا فقر و فاقہ و بےبسی و بےچارگی کے چھاؤں میں گذرا۔ انہیں ایک دن بھی چین نصیب نہ ہوا۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اطمینان و سکون کا سانس نہ لے سکے۔ ایک روز بھی زمانہ اور ارباب زمانہ نے آرام نہ لینے دیا۔ اقارب عقارب ثابت ہوئے اور ان تمام چیزوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ ابتدائی تعلیم جو

انہوں نے اپنے والد سے ترک دنیا، بے ثباتی عالم اور ہمہ گیری عشق کے حاصل کی تھیں روز بروز زیادہ پائدار ہوتی گئیں اور اس لئے ان کی یاس انگیز فطرت کو مضبوط تر کر دیا۔ ان کو خود اس بات کا احساس تھا کہ وہ دنیا کے قابل نہیں ہیں اور نہ وہ سلاطین و امرا کے دربار و مجالس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

مجھ کو دماغ وصفِ گل و یاسمن نہیں
میں جوں نسیم باد فروشِ چمن نہیں

تھا میں فقیر پر نہ گیا شاہ کے حضور
اتنے لئے کہ رتبۂ عزت مرا ہے دور

آداب سلطنت سے نہیں مجھ کو رابطہ
حرکت نہ ہوئی مجھ سے کوئی غیر ضابطہ

صحبت میں خدا جانے پڑے کیسا اتفاق
کیا بات آوے بیچ میں بے رنگی ہے شاق

امیر زادوں سے دِلّی کے نہ مِل تا مقدور
کہ ہم فقیر ہوئے ہیں انہیں کی دولت سے

اور اسی کا نتیجہ تھا کہ دہلی کی چہل و پنج سالہ زندگی میں بھی انہوں نے کسی امیر حتیٰ کہ خود احمد شاہ بادشاہ کی تعریف میں بھی کچھ نہیں لکھا اور لکھنؤ میں اگرچہ آصف الدولہ اور سعادت علی خاں دونوں کے عہد میں رہے لیکن تمام دیوان میں صرف آصف الدولہ کے نام دو یا تین

قصیدے ہیں اور بس۔

میر صاحب کی قناعت پیشگی یا ان کی انتہائی ناکامیوں نے ان کو اور اس کی تمام دلچسپیوں اور کششوں سے بے نیاز کر دیا تھا اور جو شخص اس قدر مایوس ہو چکا ہو وہ نہ صرف اظہار رائے میں بے باک وبے پروا ہو جاتا ہے بلکہ بہت زیادہ حساس بھی۔ اسے آزاد نے ان کی نازک مزاجی و بد دماغی بنا کر ایسے بے سرو پا قصّے اپنی کتاب میں لکھے ہیں کہ دیکھ کر تعجب و حیرت ہوتی ہے میر صاحب اپنی اس تیزیٔ احساس کا اس طرح تذکرہ کرتے ہیں:۔

"ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

اسی کو لوگوں نے بد دماغی کہا اور پھر اس خیال کے ماتحت ان کی ہر ہر بات کو اسی نزاکت مزاجی پر محمول کرنا شروع کر دیا۔ میر صاحب نے اسکی تصویر یوں کھینچی ہے۔

عزت کی کوئی صورت دکھلائی نہیں دیتی
چپ رہیے تو چشمک ہے کچھ کہیئے تو گالی ہے

ابتداءً انہوں نے لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی بہت کوشش کی اور اپنا پوزیشن صاف کرنے کی سعی میں مصروف رہے اور اسی طرح اپنی وسعت مشرب کا اظہار کرنے کے بعد کہ:۔

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد
دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

پھر فرماتے ہیں کہ لوگوں نے ان کو سمجھا ہی نہیں ہے:۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

نکتہ داں بھی خدا نے تم کو کیا
پر ہمارا نہ مدعا سمجھے

یہ چیز بھی کوئی اثر پیدا نہ کر سکی اور اس کے لئے بھی میر صاحب نے اپنے کو ملزم قرار دیا۔

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسی نے

کوئی خواہاں نہیں ہمارا میرؔ گویا اک جنس ناروا ہیں ہم

اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

میر صاحب کو دیکھے جو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

آوازہ جہاں میں ہمارا سنا کرو
عنقا کے طور زیست ہے اپنی برائے نام

ہر چند میرؔ بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

اس بربادی و خانہ خرابی نے ان کے کلام میں وہ درد وہ سوز وہ گداز وہ مایوسی وہ حسرت اور

اس کے ساتھ وہ زور پیدا کر دیا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ آپ اس کو پڑھیں اور اس سے متاثر نہ ہوں۔ میر صاحب کو خود اس بات کا علم تھا کہ سچی آپ بیتی سے انسان کا دل ضرور متاثر ہوتا ہے ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

چنانچہ انہوں نے بکثرت اس طرف اشارہ کیا ہے:۔

کیا تھا ریختہ پر دہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

درہمی حال کی ہے سارے مرے دیواں میں
سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

تب گرم سخن کہنے لگا ہوں میں یک عمر
جوں شمع سر شام سے تا صبح جلا ہوں

مجھ کو شاعر نہ کہیو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

جہاں سے دیکھئے یک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

ہر ورق ہر صفحہ میں اک شعر شور انگیز ہے
عرصۂ محشر کا عرصہ ہے مرے دیوان کا

بعد ہمارے اس فن کا جو کہ ماہر ہو وے گا
درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

باتیں ہماری یاد رہیں پھر یہ باتیں ایسی سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تک سر دھنیے گا

اس کے ساتھ ہی میر کو خود بھی اپنے کمالِ فن کا احساس تھا اور کیوں نہ ہو کہ :-

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو
چاہیے اہلِ سخن میر کو استاد کریں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

دیوان میر صاحب ہر اک کے ہے بغل میں
دو چار شعر ہم بھی ان کے لکھا کریں گے

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

پڑھ غزل میر کی جو ہو وے یاد
ان کو تو اس ہیں کہتے ہیں استاد

اور اپنے کلام کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا اس طرح نقشہ کھینچتے ہیں :-

اشعار میر صاحب نے چن چن کے رکھ لیے ہیں
رکھیں گے یاد ہم کچھ بیتیں چیدہ چیدہ

ان کا کلام صرف شمالی ہند میں مقبول نہ تھا بلکہ تمام جنوبی ہند میں بھی اس کی دھوم تھی :-

سر سبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ
کچھ ہند ہی میں میرؔ نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دِ وانا دکن تمام

یہ شہرت و ناموری ہندوستان ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ فارسی کی تقلید کی وجہ سے ایران میں بھی ان کا کلام ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے :-

تبعیت سے جو فارسی کے میں نے شعر کہے
سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

لیکن وہ شہرت ہی کیا جو اُردو فارسی جاننے والوں تک ہی محدود رہے شاعر تلمیذ الرحمٰن ہے اور اس کا کہا سارے جہان پر چھا جانا چاہیئے۔

ع سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ
پہ مرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

میر صاحب کی اسی اُستادی کے حق بجانب دعوی نے ان کی ان کے معاصرین سے بھی اچھی طرح نہ نبھنے دی لیکن یہ معاصرانہ چشمک کسی بڑے شاعر سے نہ تھی اور اس میں بھی میر صاحب کا قصور نہیں کیونکہ ان کے ہمعصروں نے جو شاعری میں ان کی برابری نہ کر سکتے تھے

ان کے دعوے کو تعریض سمجھ کر اُن پر حملے کرنے شروع کر دیے، اور مجبوراً اُن کو بھی ان کا جواب دینا پڑا عام طور سے وہ اپنی برتری کا اس طرح دعویٰ کرتے ہیں :-

دعوے کو یار آگے معیوب کر چکے ہیں
اس ریختہ کو ورنہ ہم خوب کر چکے ہیں

حسنِ کلام کھینچے کیوں کر نہ دامنِ دل
اس کام کو ہم آخر مجبوب کر چکے ہیں

کہاں عاجز سخن، قادر سخن ہوں
ہمیں ہے شبہہ یاروں کے سخن میں

فکر بلند سے میں کیا آسماں اُسے
ہر اک سے میرؔ خوب ہو یہ وہ زمیں نہیں

کوئی تو زمزمہ کرے میرا سا دل خراش
یوں تو قفس میں اور گرفتار بہت ہیں

ریختہ کاہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں میرؔ
جو زمیں نکلی اُسے تا آسماں میں لے گیا

اپنے زمانہ کے کم رتبہ شعرا کے متعلق لکھتے ہیں :-

کس کا ہے قماش ایسا گوڑ بھرے ہیں سارے
دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

بے سوز دل کسوں نے کہا ریختہ تو کیا
گفتارِ خام پیشِ عزیزاں سند نہیں

ان عام چشمکوں کے علاوہ خاص خاص شعراء سے بھی

ان سے شاعرانہ معرکے ہوئے ہیں۔ ان کے ہمعصر بقاؔ تھے انھوں نے یہ دو شعر کہے :۔

اِن آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے
دوآبہ جہاں میں یہ مشہور ہے
سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں
ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

میر صاحب نے بھی اپنے ایک شعر میں اسی دوآبے کے مضمون کو باندھا ہے :۔

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

بقاؔ کو شبہہ ہوا کہ میر صاحب نے یہ مضمون اُن سے اُڑایا ہے، پھر کیا تھا، فوراً بگڑ کر یہ قطعہ لکھ ڈالا :۔

میرؔ نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا
اے بقاؔ تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو
یا خُدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے
اور بینی کا یہ عالم ہو کہ ترہ بینی ہو

ایک اور قطعہ میں کہتے ہیں :۔

توبہ زاہد کی توبہ تلّی ہے
چلتے بیٹھے تو شیخ چلّی ہے
پگڑی اپنی سنبھالیےؔ گا میرؔ
اور بستی نہیں یہ دِلّی ہے

ایک مرتبہ سؔودا سے بھی چشمک ہو گئی تھی اور اُس پر سودا نے کہا:۔

؎ نہ پڑھیو غزل سؔودا تو ہرگز میر کے آگے
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا جانے

مؔیر صاحب نے بھی اس کا جواب دیا:۔

؎ طرف ہونا مرا مشکل ہے مؔیر اس شعر کے فن میں
یونہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

جب ان کے ہمعصر شعرا کا یہ حملہ بہت بڑھ گیا تو انہوں نے بھی مجبوراً ایک مثنوی "اژدر نامہ" کے نام سے لکھی اس میں اپنے کو اژدر اور دوسرے شعراء کو کیڑوں مکوڑوں سے تشبیہہ دے کر کہتے ہیں:۔

؎ کہاں پہنچے مجھ تک یہ کیڑے حقیر
گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

اس کا جواب نؔثار شاگرد حؔاتم نے لکھا اس کا مقطع یہ ہے

؎ حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے مجھے
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

لیکن واقعہ یہ ہے کہ میر صاحب اپنے ہمعصروں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

میر اس غزل کو خوب کہا تھا ضمیر نے
پر اے زباں دراز بہت ہو چکی خموش

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنیٰ

گیا ہو میر دیوانا رہا سودا سو مستانہ

داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر
ہو نجات اس کی بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

کبار ہا ہے مشاعرے ہیں اب
لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں

میر اور میرزا و خواجہ میر
کتنے یک بہ جوان ہوتے ہیں

ان کو خود اس بات کا احساس تھا کہ یہ کمالِ شاعری ہی ان کے زوال کا سبب ہے :۔

بلا ہوئی ہے مری گو کہ طبع روشن میر
ہوں آفتاب ولیکن زوال دیتا ہوں

اور اسی لئے وہ اس انتخابِ فن پر افسوس کرتے ہیں

کسب اور کیا ہوتا عوض ریختہ کے کاش
پچھتائے بہت میر ہم اس کام کو کر کر

اور اسی بے قدری کا اثر تھا کہ آخری زمانہ میں ان کے اشعار میں گرمی نہ رہی تھی کہ بہ تنور اب شعلہ کی جگہ راکھ کا ڈھیر تھا ؂

آہوں کے شعلے جس جا اُٹھتے تھے میر سے شب
واں جا کے صبح دیکھا مشتِ غبار پایا

بدرساں اب آخر چھا گئی مجھ پر یہ آگ
ورنہ پہلے تھا مرا جوں ماہِ نو دامن جلا

لیکن جس شخص کا لائحہ عمل صرف گریہ و زاری اور آہ و بکا ہو، اس کی کب تک خبر منائی جائے۔

یا روئے یا رُلایا، اپنی تو یونہی گذری
کیا ذکر ہم صفیراں، یاران شادماں کا

دل بیٹھ گیا اور زورِ طبیعت ختم ہو گیا:۔

لطفِ سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میر
اب شعر ہم پڑھے ہیں تو وہ شدّ و مد نہیں

میر کس کو اب دماغ گفتگو
عمر گذری ریختہ چھوٹا گیا

اور آخر اپنی موت کی اس طرح پیشین گوئی:۔

کب نیازِ عشق نازِ حسن سے کھینچے ہے ہاتھ
آخر آخر میر سر بر آستاں مارا گیا

اسی خاتمہ بالخیر پر ہم بھی ان کے ساتھ شریکِ دعا ہیں:۔

اب خدا مغفرت کرے اسکو
میر مرحوم تھا عجب کوئی

---

# غزلیات

## خواجہ میر دردؔ

(۱)

جگ میں نہ کوئی ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
یک بیک نام لے اٹھا میرا
جی میں کچھ اس کے آگیا ہوگا
اُس نے قصداً بھی میرے نالے کو
نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا

دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

(۲)

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا
پر اُسے آہ! کچھ اثر نہ کیا
سب کے یاں تم ہوئے کرم فرما
اس طرف کو کبھی گذر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم
نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے پاس میں آیا
جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا

کتنے بندوں کو جان سے کھویا کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
کون سا دل ہے جس میں خانہ خراب خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا
سب کے جوہر نظر میں آئے درؔد
بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

(۳)

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینے کے سامنے جب آ کے ہو کریں
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں
ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں
نے گُل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں
ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر
اے درؔد آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں

(۴)

آرام سے کبھو بھی نہ یکبار سو گئے

ایسے ہمارے طالعِ بیدار سو گئے
خواب عدم سے چونکے تھے ہم تیرے واسطے
آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے
اُٹھتی نہیں ہے خانۂ زنجیر سے صدا
دیکھو تو کیا سبھی یہ گرفتار سو گئے؟
وہ مر چکے جو رونقِ بزمِ جہان تھے
اب اُٹھیے دردؔ یاں سے کہ سب یار سو گئے

(۵)

تہمتِ چند اپنے ذمّہ دھر چلے
کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
کیا ہمیں کام اِن گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے اِدھر اودھر چلے
دوستو! دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشمِ نم آئے تھے دامن تر چلے
ہم جہاں میں آئے تھے تنہا و لے
ساتھ اپنے اب اُسے لیکر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

# میر تقی میر

(۱)

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہی ناصح تو کب تک مرے مُنہ کو دھوتا رہے گا
بس اے گریہ آنکھیں ترے کیا نہیں ہیں کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہے گا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا
بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا!

(۲)

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا! اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لی آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صُبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کی سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے تو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُنے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اِسلام کیا

(۳)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونسِ ہجراں سو وہ مُدّت سے اب نہیں آتا
دِل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا!

جی میں کیا کیا ہے اپنے ای ہمدم　پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

(۴)
گُل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بُلبُل
یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بُلبُل
کی سیرِ جذبِ اُلفت گُل چیں نے کل چمن میں
توڑا تھا شاخ گُل کو نکلی صدائے بُلبُل
کھٹکے ہیں خار ہو کر ہر شب دلِ چمن میں
اتنے لب و دہن پر یہ نالہائے بُلبُل
یکرنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہے
گُل میں رنگیں نہیں ہیں، ہیں نقش پائے بُلبُل
آئی بہار گلشن گُل سے بھرا ہے لیکن
ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بُلبُل
پیغام بے غرض بھی سنتے نہیں ہیں خوباں
پہنچی نہ گوشِ گُل تک آخر دُعائے بُلبُل
یہ دلخراش نالے ہر شب کے میرؔ تیرے
کر دیں گے بے نمک ہی شورِ نوائے بُلبُل

(۵)
بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں　ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہے　اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں
ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن　مرضِ عشق کا علاج نہیں
شہرِ خوبی کو خوب دیکھا میرؔ
جنسِ دِل کا کہیں رواج نہیں

(۶)

دیکھ تو دل سے جاں سے اُٹھتا ہے — یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک — شعلہ اک صبح یاں سے اُٹھتا ہے
خانۂ دل سے زینہار نہ جا — کوئی ایسے مکاں سے اُٹھتا ہے
نالہ سر کھینچتا ہے جب میرا — شور اک آسماں سے اُٹھتا ہے
بیٹھنے دے ہے کون پھر اُسکو — جو ترے آستاں سے اُٹھتا ہے
یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم — جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے
عشق، میرؔ ایک بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اُٹھتا ہے

(۷)

اب جو اک حسرتِ جوانی ہے — عمرِ رفتہ کی یہ نشانی ہے
رشکِ یوسف ہے آہ وقتِ عزیز — عمر اک بارِ کاروانی ہے
گریہ ہر وقت کا نہیں بے ہیچ — دل میں کوئی غمِ نہانی ہے
اس کی شمشیر تیز ہے ہمدم — مر رہیں گے جو زندگانی ہے

(۸)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے — ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ — سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا — ہمیں آپ سے بھی جُدا کر چلے
جبیں سجدے کرتے ہی کرتے گئی — حقِ بندگی ہم ادا کر چلے
پرستش یہاں تک کی اے بت تجھے — نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

نہ دیکھا غم دوستاں شکر ہے ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے
گئی عمر در فکرِ بند غزل سو اِس فن کو ایسا بڑھا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں ہم آئے تھے کیا کر چلے

# سیّد انشاء اللہ خاں انشآ

(۱)

فقیرانہ ہے دل مقیم اسکی رہ کا غرض کیا کہ محتاج ہو بادشہ کا
خرابات کی جب سے لذت پڑی ہے چُھٹا بیٹھنا مسجد و خانقہ کا
صنم خانہ جاتا ہوں تو مجھ کو ناصح نہ بہکا نہ بہکا نہ بہکا نہ بہکا
تری آشنائی میں کیا ہم نے پایا دیا نقد دِل اور اپنی گرہ کا
کبھی تجھ سے اِنشآ نے بوسہ نہ مانگا
گنہگار ہے وہ فقط اِک گنہ کا

(۲)

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شئے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے .... لا
قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں اُٹھ کہیں گھر چل
خدا کے واسطے اتنے تو پاؤں مت پھیلا
نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنوں
کہ روز دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلا
گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درونِ کوہ سے نکلی صدائے واویلا

نزاکت اِس گُلِ رعنا کی دیکھیو انشؔا
نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

(۳)

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سُوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں
بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے ان دِنوں پہروں
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں!
کہاں صبر و تحمل، آہ! ننگ و نام کیا شئے ہے
غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کِسے اِنشؔا
غنیمت ہے کہ ہمصورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

(۴)

دو گھڑی دن سے کہا میں نے کہ کیا ارشاد ہے
سُن کے بولے اب ہوا کیا بات تیری یاد ہے
خاک پر مت پھینک اے ساقی یہ دُردِ تہ نشیں
چاٹ جاویں گے حریف اس کو یہ مے کی گاد ہے
سن کے یہ اشعار میرے کہتے ہیں یہ اہلِ رشک

کوئی اس کو کیا کرے یہ تو خدا کی داد ہے
میں کہے دیتا ہوں انشاؔ سے ذرا بچ کھیلیو!
وہ بلا ہے، قہر ہے، آفت ہے، اک استاد ہے

# خواجہ حیدر علی آتشؔ

(۱)

حُسنِ پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہُشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا
گُل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بُلبُل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا
گریاں ہے اگر شمع تو سر دُھنتا ہے شعلہ
معلوم ہوا سوختہ پروانہ ہے اُس کا
وہ شوخ نہاں گنج کے مانند ہے اس میں
معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اُس کا
جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اُسکی
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُس کا
وہ یاد ہے اُس کی کہ بھُلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اس کا
یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اس کا
آوارگیٔ نکہتِ گُل ہے یہ اِشارہ!

جامہ سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اس کا
یہ حال ہوا اس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا جو ہے بے گانہ ہے اُس کا
شکرانۂ ساقی ازل کرتا ہے آتشؔ
لبریزِ مے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

(۲)

مری آنکھوں کے آگے آئے گا کیا جوش میں دریا
ہمیشہ صورتِ ساحل رہے آغوش میں دریا
خموشی اور گویائی مری اِک اک سے بہتر ہے
سکونت میں یہ قطرہ ہے گہر، تو جوش میں دریا
کیا جو ضبطِ گریہ تو کیا دریا کو کوزے میں
کبھی دل کھول کر رویا تو آیا جوش میں دریا
اگر موتی نہ بنتے قطرہ ہائے ابرِ نیساں سے
تو حلقہ ڈالتا آتشؔ صدف کے گوش میں دریا

(۳)

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا
زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گُل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا
اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا
صیاد اسیرِ دامِ رگِ گُل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اُسے دام و دانہ کیا
طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا
آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا
ہوتا ہے زرد سُن کے جو نامرد مدعی
رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا
صیاد گل عذار دکھاتا ہے سیرِ باغ
بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا
یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

# حکیم مومن خاں مومن

(۱)

غیر آ کر قریب خانہ رہا　　شوق اب تیرے آنے کا نہ رہا
تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری　　تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا
غم مرا کس لئے کہ دنیا میں　　نہ رہا ہیں مرا فسانہ رہا

کس کی زلفوں کا دھیان تھا کہ بن شب — محوِ دودِ چراغ خانہ رہا
دل لگا نکلے تو اٹھائے مزے — جی بلا سے رہا رہا نہ رہا
تو فلک مرگ ہم سے سب غافل — اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

مومن اس بت کے ہم نہ ہی ہیں
تم کو دعوائے اتقا نہ رہا

(۲)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
بے وفا کہنے کی شکایت ہے — تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
حال دل یار کو لکھوں کیونکر — ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

(۳)

بے صبر کو کہاں تپ داغ جگر سے فیض
گل چیں کو کب ہوا شجر بارور سے فیض
یاد خطِ نگار میں ہم زہر کھا موئے
کیا آب زندگی کا ہوا ہے خضر سے فیض
بالطبع گر کرم ہو تو مفلس بھی ہے کریم
ہوتا ہے سایہ کا شجر بے ثمر سے فیض

ملنے کو خاک ہی میں بخیلوں کا مال ہے
دیکھو تو ہے کسی کو بھی غنچہ کے زر سے فیض

شب بھر کیا ہے مبدءِ فیاض[1] کا گلہ
تو بھی عیاں ہوا نہ دعائے سحر سے فیض

تصویر سے تری مجھے تسکین دل کہاں
کیا خاک تشنہ کام کو آبِ گہر سے فیض

کیونکر نہ غم ہو خلق کو مومن کی مرگ کا
تھا سب کو اس کی ذاتِ سراپا ہنر سے فیض

(۴)

آبِ گریہ میں ڈوب جائیں گے ہم
یوں آتشِ دل بجھائیں گے ہم

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی
پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

تو، بخت، عدو، اجل، فلک، دل
کس کس کے ستم اُٹھائینگے ہم

گر ہے دلِ غیر نقش[2] تسخیر
تو تیرے لئے جلائیں گے ہم

بتخانہ چین[3] ہو گو تیرا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

---

[1] تمام اشیا کا آغاز کرنیوالا جو بڑا فیض رساں ہے یعنی حق تعالے۔

[2] وہ نقش جس کے ذریعہ سے کسی کو مطیع کرتے ہیں قاعدہ ہے کہ نقش کو اکثر کسی مراد کے لئے جلایا جاتا ہے۔

[3] بتخانہ چین کی تخصیص اس لئے کی ہے کہ چین کی نقاشی بہت مشہور ہے۔

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہیے ستانے کو
صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال — ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
برق کا آسماں پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو
شکوہ ہے غیر کی کدورت کا — سو مرے خاک میں ملانے کو
کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں — آسماں کے ستم اٹھانے کو
چل کے کعبہ میں سجدہ کر مومن
چھوڑ اس بت کے آشیانے کو

(۶)

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے — کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ — غش تمہیں دیکھ کر نہ ہو جائے
کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم — کہیں پامال سر نہ ہو جائے
میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں — کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے
اے قیامت نہ آئیو جب تک — وہ مری گور پر نہ ہو جائے
مومن ایماں قبول دل سے مجھے
وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

# شیخ محمد ابراہیم ذوق

(۱)

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا　　فرشتہ اُس کا ہم پایا نہ پایا
مقدر ہی یہ گر سودِ زیاں ہے　　تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا　　کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
کہے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا　　دہن پایا لبِ گویا نہ پایا
سراغ عمرِ رفتہ ہاتھ کیا آئے　　کہیں جس کا نشانِ پا نہ پایا
نظیر اس کی کہاں عالم میں اے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

(۲)

وقتِ پیری شباب کی باتیں　　ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
اس کے گھر لے چلا مجھے دیکھو　　دلِ خانہ خراب کی باتیں
حرف آیا جو آبروپہ مری　　ہیں یہ چشمِ پر آب کی باتیں
مجھ کو رسوا کریں گی خوب اے دل　　تیری یہ اضطراب کی باتیں
سنتے ہیں اس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم　　کس مزے سے عتاب کی باتیں
ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوق
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

(۳)

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو
آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو
آن پہنچی سرِ گرداب فنا کشتیٔ عمر
ہر نفس بادِ مخالف کا ہے جھونکا ہم کو
اپنا ہے کعبۂ مقصود فقط گوہرِ دل

طوف گرداب صفت چاہیے اپنا ہم کو

ہم نہ کہتے تھے کہ ذوقؔ اسکی تو زلفوں کو نہ چھیڑ

اب وہ برہم ہے تو ہے تجھ کو قلق یا ہم کو

(۴)

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ
تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ

گر میری طرح دوش پہ ہو بارِ محبت
ہو پشتِ فلک میں ابھی خم اور زیادہ

اے خنجرِ خونخوار! نہ بُرش میں کمی کر
ہاں تجھکو مرے سر کی قسم اور زیادہ

ہے باغ جہاں میں تجھے گر ہمتِ عالی
کر گردنِ تسلیم کو خم اور زیادہ

لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمرور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

جو کنجِ قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر

ہے ذوقؔ برابر انہیں کم اور زیادہ

(۵)

کل جہاں سے کہ اُٹھا لائے تھے احباب مجھے

لے چلا آج وہیں پھر دلِ بیتاب مجھے

میں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں بھی ہمیشہ خط میں

قبلہ و کعبہ لکھا کرتا تھا القاب مجھے

جو مرے واقفِ جوہر ہیں وہ رکھتے ہیں عزیز

تیرہ بختی میں بھی جوں تیغ سیہ تاب مجھے

کنجِ تنہائی میں دبتا ہوں دلاسے کیا کیا

دلِ بیتاب کو میں اور دلِ بیتاب مجھے

(۶)

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے
بڑھتی جاتی ہے جو مشق ستم اس ظالم کی
کچھ محبت مری اصلاح مگر دیتی ہے
دیتی شربت ہے کسے زہر بھری آنکھ تری
عین احسان ہے وہ زہر اگر دیتی ہے
شمع بھی کم نہیں کچھ عشق میں پروانے سے
جان دیتا ہے اگر وہ تو یہ سر دیتی ہے
کوئی غمّاز نہیں میری طرف سے ای ذوق
کان اُسکے مری فریاد ہی بھر دیتی ہے

(۷)

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
کم ہونگے اس بساط پہ ہم جیسے بدقمار
جو چال ہم چلے وہ نہایت بُری چلے
ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے
نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو وہی

دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے
دُنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے
جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

# مرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱)

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
عشرتِ قتل گہ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۲)

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

(۳)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا ہے عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا

جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۴)

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
داغ دل گر نظر نہیں آتا — بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تمکو مگر نہیں آتی

(۵)

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں — سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں انکی رنجشیں — پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

(۶)

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

(۷)

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابندِ نے نہیں ہے
ہر چند ہر اک شے میں تو ہے پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کیوں ردّ قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے؟ اے نہیں ہے

# مولانا الطاف حسین حالی

(۱)

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعبِ جمال تیرا
گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا
پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کے کوئی
پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا
ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کے جمال تیرا
دل ہو کہ جان، تجھ سے کیونکر عزیز رکھئے
دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا
بیگانگی میں حالیؔ یہ رنگِ آشنائی
سن سن کے سر دھنیں گے قال اہل حال تیرا

(۲)

دیکھ اے اُمید کیجو ہم سے نہ تو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا
یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے
اے آسماں کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا
دُنیا کے خرخشوں سے چیخ "اُٹھتے" تھے ہم اول
آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا
انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے
جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا
افسوس اہل دیں بھی مانند اہل دنیا
خود کام خود نما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا
کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا
حالی سے کام ہے یاں فعلوں سے اسکے کیا کام
اچھا ہے یا بُرا ہے پھر یار ہے ہمارا

(۳)

رنج اور رنج بھی تنہائی کا — وقت پہنچا مری رسوائی کا
عمر شاید نہ کرے آج وفا — کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا
ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم — شوق تھا بادیہ پیمائی کا
سات پردوں میں نہیں ٹھہری آنکھ — حوصلہ کیا ہے تماشائی کا
درمیاں پائے نظر ہے جب تک — ہم کو دعویٰ نہیں بینائی کا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی ہے جو یہ شوق خود آرائی کا
یہی انجام نہاں ہے فصل خزاں گل و بلبل کی شناسائی کا
ہوں گے حالیؔ سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

(۴)

بری اور بھلی سب گزر جائیگی یہ کشتی یونہی پار اُتر جائے گی
ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پتہ ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا کوئی دن میں گنگا اُتر جائیگی
نہ پوری ہوئی ہیں اُمیدیں نہ ہوں یونہی عمر ساری گذر جائے گی
سنیں گے نہ حالیؔ کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

# پنڈت برج نرائن چکبست

(۱)

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا
وہ گلشن کی فضا اور چاندنی کا وہ نکھر جانا
وہ بڑھ کر گیسوئے لیلائے شب کا تا کمر جانا
عروس جاں نیا پیراہن ہستی بدلتی ہے
فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گذر جانا
مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں

مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا
اجل کی نیند میں بھی خوابِ ہستی گر نظر آیا
تو پھر بیکار ہے تنگ آ کے اس دنیا سے مر جانا
وہ طبع یاس پرور نے مجھے چشمِ عقیدت دی
کہ شامِ غم کی تاریکی کو بھی نورِ سحر جانا
وہی قطرہ لہو کا اشک بن کر کر گیا رسوا
جسے ہم نے نمک پروردۂ زخمِ جگر جانا
مقام کوچ کیا ہے منزلِ مقصود تک بھولے
قیامت تھا سرائے دھر میں دو دن ٹھہر جانا
چمن زارِ محبت میں اسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا
سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شاید روح نے گردِ سفر جانا

(۲)

زباں سے جوشِ قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا
اُبلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا
بہت پنہاں رہی دل میں خلش خارِ تعصب کی
مگر ایسے امتحاں کے وقت پیدا ہو نہیں سکتا
جدا سینے سے دل ہو دست و باز و قوم کے شل ہوں
مگر دل سے جدا دم بھر یہ کانٹا ہو نہیں سکتا
گراں ہے جنس اور نیت خریداروں کی ابتر ہے

اب اس بازار میں الفت کا سودا ہو نہیں سکتا
جسے ہے فکر مرہم کی اُسے قاتل سمجھتے ہیں
الٰہی خیر ہو یہ زخم اچھا ہو نہیں سکتا

(۳)

جہاں میں آنکھ جو کھولی، فنا کو بھول گئے
کچھ ابتدا ہی سے ہم انتہا کو بھول گئے
نفاقِ گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
یہ بت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے

ہوا مزاج کا عالم یہ سیرِ یورپ سے
کہ اپنے ملک کی آب و ہوا کو بھول گئے
زمین لرزتی ہے بہتے ہیں خون کے دریا
خودی کے جوش میں بندے خدا کو بھول گئے

یہ انقلاب ہوا عالمِ اسیری میں
قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

# فانی بدایونی

(۱)

حاصلِ علمِ بشر جہل کا عرفاں ہونا
عمر بھر عقل سے سیکھا کئے ناداں ہونا
چار زنجیر عناصر پہ ہے زنداں موقوف
وحشتِ عشق ذرا سلسلہ جنباں ہونا

دل بس اک لرزشِ پیہم ہے سراپا یعنی
تیرے آئینے کو آتا نہیں حیراں ہونا
فالِ افزونی مشکل ہے ہر آسانی کار
میری مشکل کو مبارک نہیں آساں ہونا
راحت انجامِ غم اور راحتِ دنیا معلوم
لکھ دیا دل کے مقدر میں پریشاں ہونا
دے نہ احسن تغافل، جسے جو چاہے فریب
ورنہ تو اور جفاؤں سے پشیماں ہونا
ہائے وہ جلوۂ ایمن وہ نگاہِ سرِ طور
فتنہ ساماں سے ترا فتنۂ ساماں ہونا
خاکِ فانی کی قسم ہے تجھے اے دستِ جنوں
کس سے سیکھا ترے ذرّوں نے بیاباں ہونا

(۲)

محتاج اجل کیوں ہے خود اپنی قضا ہو جا
غیرت ہو تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہو جا
اے شوقِ طلب بڑھ کر مجنونِ ادا ہو جا
اے ہمتِ مردانہ راضی بہ رضا ہو جا
آغوشِ فنا میں ہم پر وردۂ آفت ہیں
اے فتنۂ دوراں اُٹھ اے حشر بپا ہو جا
ضد اور یہ ضد اے دل اچھا تو خدا حافظ
قرباں ہی اس ہٹ پر ہونا ہے تو جا ہو جا

اس جانِ تمنّا سے بے پردہ نہ شکوا کر
وہ تجھ سے خفا ہے تو جینے سے خفا ہو جا
ہر قافلۂ دل کو تو مژدۂ منزل دے
ہر رہ گذرِ غم میں نقشِ کفِ پا ہو جا
یہ دردِ محبّت بھی کیا شے ہے معاذ اللہ
میں دردِ محبت سے کہتا ہوں سوا ہو جا
ظالم کا نہ شکوا کر، ظلموں کی نہ پروا کر
تو اپنی وفاؤں کی عزّت پہ فدا ہو جا
اس ہستیٔ فانی سے کر قطع نظر فانیؔ
تو دوست کا طالب ہے، دشمن سے جدا ہو جا

(۳)

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اُٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ
چلے بھی آؤ وہ ہے قبرِ فانیؔ دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ
ابھی کیا ہے کسی دن خوں رلا دے گی یہ خاموشی
زبانِ حال کی جادو بیانی دیکھتے جاؤ
غرورِ حسن کا صدقہ، کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ
اُدھر منہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو اِدھر دیکھو
مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

بہار زندگی کا لطف دیکھا اور دیکھو گے
کسی کا عیش مرگ ناگہانی دیکھتے جاؤ
سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ
وہ اُٹھا شور ماتم آخری دیدار میت پر
اب اُٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ

(۴۲)

دنیا میری بلا جانے، مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے
آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے
خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اُسے ہونا کہتے ہیں
نیست نہ ہو تو ہست نہیں یہ ہستی کیا ہستی ہے
عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے راز بلندی پستی ہے
جان سی شے بک جاتی ہے، ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے
وحشت دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے
جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

فانیؔ جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

(۵)

قطرہ دریائے آشنائی ہے
کیا تری شانِ کبریائی ہے

تیری مرضی جو دیکھ پائی ہے
خلش درد کی بن آئی ہے

وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا
نارسائی سی نارسائی ہے

کون دل ہے جو درد مند نہیں
کیا ترے درد کی خدائی ہے

جلوۂ یار کا بھکاری ہوں
شششِ حبیب کاسۂ گدائی ہے

موت آتی ہے تم نہ آؤ گے
تم نہ آئے تو موت آئی ہے

بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے
کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

ترکِ اُمید بس کی بات نہیں
ورنہ امید کب بر آئی ہے

مژدۂ جنّتِ وصال ہی موت
زندگی محشرِ جدائی ہے

آرزو پھر ہے درپئے تدبیر
سعیِ ناکام کی دہائی ہے

موت ہی سا تھ دے تو دے فانیؔ
عمر کو عذرِ بے وفائی ہے

(۶)

اک فسانہ سُن گئے اک کہہ گئے
میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

یا ترے محتاج ہیں اے خونِ دل ۔ یا اُنہیں آنکھوں سے دریا بہ گئے
موت انکا منہ ہی تکتی رہ گئی ۔ جو تری فرقت کے صدمے سہ گئے
تو سلامت ہے تو ہم اے دردِ دل ۔ مر ہی جائیں گے جو جیتے رہ گئے
پھر کسی کی یاد نے تڑپا دیا ۔ پھر کلیجہ تھام کر ہم رہ گئے

اُٹھ گئے دنیا سے فانی اہلِ ذوق
ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

# ڈاکٹر سر محمد اقبال

(۱)

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی ۔ مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا ۔ خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا ۔ تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا انکو آنے میں قاصد ۔ مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی
کھنچے خود بخود جانبِ طور موسیٰ ۔ کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

(۲)

انوکھی وضع ہے، سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں

جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری اُمیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

رُلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا، نرالے میرے نالے ہیں

نہ پوچھو مجھ سے لذّت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

نہیں بے گانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

اُمیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

(۳)

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنّت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

(۴۱)

زندگی انساں کی اِک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے رم کے سوا کچھ بھی نہیں
گُل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں
زائرانِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں

# قطعات

## انجام ہستی

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا    یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر    میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

---

آئی نظر جو گورِ سلیماں کی ایک روز    لوحِ پہ اس مزار کے تھا یہ رقم ہوا
کای سرکشاں جہان میں کھینچا تھا میں بھی سر    پایانِ کار مور کی خاک قدم ہوا
کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں    نادان! یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

---

## دنیا جائے عبرت ہے

یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول
گل گشت سرسری نہیں اس گلستان کا
گل یادگارِ چہرۂ خوباں ہے بے خبر
مرغِ چمن نشاں ہے کسو خوش زبان کا

مر گئے پر خاک ہے سب کبر و ناز — مت جھکا گو سر کسو مغرور کا
ٹھیکری کو قدر ہے اسکو نہیں — ٹوٹے جب کاسہ سر فغفور کا

## وقت رحلت کسی کنے زر تھا

بے زری کا نہ کر گلہ غافل — رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا
اتنے منعم جہان میں گزرے — وقت رحلت کسی کنے زر تھا؟
صاحبِ جاہ و شوکت و اقبال — یک ازاں جملہ اب سکندر تھا
تھی یہ سب کائنات زیر نگیں — ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا
لعل و یاقوت و ہم زر و گوہر — چاہیے جس قدر میسر تھا
آخرِ کار جب جہاں سے گیا — ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

(میر)

## ترک دنیا

کل ایک تارک دنیا سے میں نے پوچھا ذوق
کہ تو اُکھڑ کے اُدھر سے اِدھر ہوا پیوست
گزرتی ہوگی بآرام زندگی تیری
کہ تجھ کو اب نہ غم نیست ہے نہ شادی[۱] ہست
کہا یہ اس نے کہ قیدِ حیات میں انسان

---

۱؎ مال کی خوشی

کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گو ہو مستِ الست
اُٹھائے ہاتھ جہاں سے ولیک کیا امکاں
کہ بافراغ کروں کنجِ عافیت میں نشست
چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دُنیا کی
تو سلسلے میں فقیری کے پھر ہوا پابست
رہا وہ خدمتِ مرشد کی قید میں برسوں
کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست
گر ایک عمر میں پہنچا مقامِ اعلیٰ پر
کہاں یہ شوق نے ہو ہمت بلند نہ پست
جو دستگاہ تصوّف میں بھی ہوئی اُسکو
تو یہ ارادہ رہا اور بھی ہو بالادست
ہمیشہ جنگ رہی بعد صلحِ کل کے بعد
کہ نفس دُشمنِ سرکش ہے اسکو دیجے شکست
جو ہوشیار ہے تو شرع کا ہے وہ پابند
پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہے مست
نہیں ہے دامِ علائق سے مطلق آزادی
مجال کیا کہ نکل جاوے کوئی کرکے جست
کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ
گیا زباں سے نکل اس کی جیسے تیر از شست

---

۱ روزِ ازل سے آزاد ۲ قید ۳ تعلقات کا جال

کہ کرد[۱] قطع تعلق کدام شد آزاد
بریدہ از ہمہ با خدا گرفتار است

# شبِ ہجر

کہوں کیا ذوق احوال شبِ ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تبِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اور آنے تھے لپینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے — مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردہ میں کئے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سنکر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اُٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب کا رشتہ — بہت سی جان توڑی جاں کنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوعِ صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے

---

[۱] جو دنیا کی سب چیزوں سے قطع تعلق کرتا ہے تو خدا کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے

لگے پانی چوانے منہ میں آنسو — پڑی ہی پیاس سرہانے بے کسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — نگار لکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بالائے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یُمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا یہ خودکشی نے

مؤذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

(ذوق)

## گذارش بحضور شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ — اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں — تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمی بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز — روشناسِ ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائش سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہئے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کی سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انساں
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوئے و خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیئے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میری ابرِ گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دوں سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا یہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(غالب)

# آمدِ بہار

پھر اس انداز سے بہار آئی | کہ ہوے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک | اسکو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر | روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی | بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لیے | چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

# طائرِ دل

اُٹھا اِک دن بگولا سا جو ہیں کچھ جوش وحشت میں
پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا دِل بیاباں سے
نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح پر بستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ او ناکام آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے
ہنسا کچھ کھِل کھِلا کر پہلے مجھ کو جو پہچانا
تو یوں رویا کہ جوئے خون بہی پلکوں کے داماں سے
کہا میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں

پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغ رضواں سے
اُسی کی زلفِ رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے
بچشمِ غور جو دیکھا مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر ہو گیا تھا خاک اپنی آہِ سوزاں سے

غالب

# بخل و اسراف

حالی سے کہا میں نے کہ ہے اس کا سبب کیا
جب کرتے ہو تم کرتے ہو مسرف کی مذمت
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخن ور
جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
اسراف بھی مذموم ہے پر بخل سے کم تر
ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا
یاروں کے لئے ہے یہ بیاں موجب رقت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اس وقت
جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تو انگر
پھر اس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت

لو اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہی نہ اقبال
گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی
پرواز کی ہو چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

---

## ہے حق میں سب کے دوست سے دشمن مفید تر

قول ایک حکیم کا ہے کہ اگر غور کیجئے
ہے حق میں سب کے دوست سے دشمن مفید تر
اول تو سوجھتا ہی نہیں عیب دوست کو
اور سوجھتا ہے تو نہیں لاتا زبان پر
پر ایک بار دشمن اگر دیکھ پائے عیب
سو سو طرح سے وہ ہی کرتا ہی جلوہ گر
دشمن سے بڑھکے کوئی نہیں آدمی کا دوست
منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر
اور دوست سے زیادہ نہیں کوئی بدسگال
رکھتا ہے جو کہ دوستکے عیب اس سے مستتر
گو قول ہے متین پہ جو ہے سخن کی تہ
افسوس ہے حکیم کی پہنچی نہ واں نظر
دشمن کے جو کہ طعن سے ہونے ہیں مستفید
عیب انکے دوست ہی نہ جتائینگے بیخطر
اور جو کہ دوست سے نہیں کہہ سکتے اپنے عیب
وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہوں گے بہرہ ور

جنکو خدا نے جوہر قابل دیا ہے یاں
موقوف عبرت انکی نہ دشمن نہ دوست پر

## تذکرۂ دہلی مرحوم

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ

نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے انہیں ظالم نہ رلانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں رہیں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیّاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں پہ نہ جانا ہرگز

چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلّی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی ہرگز
یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنیگا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز
(حالی)

# عدل فاروقی

ایک دن حضرتِ فاروق نے منبر پہ کہا
میں تمہیں حکم جو دوں اس کو کرو گے منظور
ایک نے اُٹھ کے کہا یہ کہ نہ مانیں گے کبھی
کہ ترے عدل میں ہم کو نظر آتا ہے فتور
چادریں مالِ غنیمت میں جو اب کے آئیں
صحنِ مسجد میں وہ تقسیم ہوئیں سب کے حضور
ان میں ہر ایک کے حصے میں فقط ایک آئی
تھا تمہارا بھی وہی حق کہ یہی ہے منظور
اب جو یہ جسم پہ تیرے نظر آتا ہے لباس
یہ اسی لوٹ کی چادر سے بنا ہوگا ضرور

مختصر تھی وہ ردا اور ترا قد ہے دراز
ایک چادر میں ترا جسم نہ ہوگا مستور
اپنے حصے سے زیادہ جو لیا تو نے تو اب
تو خلافت کے نہ قابل ہے نہ ہم ہیں مامور
گرچہ وہ حد مناسب سے بڑھا جاتا تھا
سب کے سب مہر بہ لب تھے چہ اناث اور چہ ذکور
روک دے کوئی کسی کو یہ نہ رکھتا تھا مجال
نشۂ عدل و مساوات میں تھے سب مخمور
اپنے فرزند سے فاروق معظم نے کہا
تم کو ہے حالتِ اصلی کی حقیقت پہ عبور
تم ہی دے سکتے ہو اس کا مری جانب سے جواب
کہ نہ پکڑے مجھے محشر میں مرا ربِّ غفور
بولے یہ ابن عمرؓ سب سے مخاطب ہو کر
اس میں کچھ والدِ ماجد کا نہیں جرم و قصور
ایک چادر میں جو پورا نہ ہوا ان کا لباس
کر سکی اسکو گوارا نہ مری طبع غیور
اپنے حصے کی بھی میں نے انہیں چادر دیدی
واقعے کی یہ حقیقت ہے کہ جو تھی مستور
نکتہ چیں نے یہ کہا اٹھ کے کہ ہاں اے فاروق
حکم دے ہمکو کہ اب ہم اسے مانیں گے ضرور
(شبلی)

# قدیم وضع اور طرز جدید

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبرؔ
تو صاف کہتے ہیں سیّد[1] یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا
جو اعتدال کی کہئے تو وہ اِدھر نہ اُدھر
زیادہ حد سے دیئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
اِدھر یہ ضد ہے کہ لمنیڈ بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ دُھن ہے کہ ساقی صراحئی مے لا
اِدھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت نایاب
ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلا و فرقتِ لیلا

---

[1] اشارہ سر سید احمد خاں کی طرف ہے

## پردہ

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

---

## بہار

بہار آئی کھلے گُل زیبِ صحنِ بوستاں ہوکر
عنادل نے مچائی دھوم سرگرمِ فغاں ہوکر
بچھا فرشِ زمرد اہتمامِ سبزۂ تر میں
چلی مستانہ وش بادِ صبا عنبر فشاں ہوکر
عروجِ نشۂ نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں
ترانے گائے مرغانِ چمن نے شادماں ہوکر
بلائیں شاخِ گل کی لیں نسیمِ صبح گاہی نے
ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگینِ بتاں ہوکر
جوانانِ چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا
کسی نے یاسمن ہوکر کسی نے ارغواں ہوکر
کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحنِ گلستاں میں

صدائے نغمۂ بلبل اُٹھی بانگ اذاں ہوکر
ہوا نے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدیکو
ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہوکر
زبانِ برگِ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں
خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہوکر
نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبرؔ پھول پتوں میں نہاں ہوکر

## جدید تعلیم

سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ — کیا ہے میں نے جسکو زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے — کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت — کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہوگیا ہے — ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفا مرا باحسرت و یاس

# سرسیّد کا قومی درد

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی کی روح
بے علم ہے اگر تو وہ انسان ہے ناتمام
بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم
نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام
تعلیم اگر نہیں ہے زمانے کے حسب حال
پھر کیا اُمید دولت و آرام و احترام
سیّد کے دل میں نقش ہوا اس خیال کا
ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام
صدمے اُٹھائے رنج سہے گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
دکھلا دیا زمانے کو زورِ دل و دماغ
بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام
نیت جو تھی بخیر تو برکت خدا نے دی
کالج ہوا درست بصد شان و احتشام

# مشرق اور مغرب

بنائے ملت بگڑ رہی ہے ،
لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں

مگر طلسمی اثر ہے ایسا ،
کہ خوش ہیں گویا ابھر رہے ہیں

ادھر ہے قوم ضعیف و مسکیں
ادھر ہیں کچھ مرشدان خود بیں

یہ اپنی قسمت کو رو رہی ہے
وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں

کٹی رگ اتحاد ملت
رواں ہوئیں خون دل کی موجیں

ہم اسکو سمجھے ہیں آب صافی
نہا رہے ہیں نکھر رہے ہیں

صدائے الحاد اٹھ رہی ہے
خدا کی اب یاد اٹھ رہی ہے

دلوں میں فریاد اٹھ رہی ہے
کہ دین سے ہم گذر رہے ہیں

قفس ہے کم ہمتی کا سینہ
پڑے ہیں کچھ دانہائے شیریں

اسی پہ مائل ہے طبع شاہیں
نہ بال ہیں اب نہ پر رہے ہیں

اگرچہ یورپ بھی مبتلا ہے
وہاں بھی پھیلی یہی بلا ہے

خیال میٹر کا بڑھ چلا ہے
خدا سے انکار کر رہے ہیں

مگر وہاں کی بنا ہے نیشن
رکا ہے ملحد کا آپریشن

نہیں ہے گم لفظ سالوشن
خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے ہیں

یہاں بجائے مزار گپ ہے
وہاں وہی عزت بشپ ہے

یہاں مساجد اجڑ رہی ہیں ۔
وکلیسا سنور رہے ہیں

جناب اکبر سے کوئی کہدے
کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے ۔

اس انجمن میں اور ایسی باتیں
یہ آپ کیا قہر کر رہے ہیں

# نفاق ہند

کبھی تھا ناز زمانے کو اپنے ہند پہ بھی
پر اب عروج وہ علم و کمال و فن میں نہیں
وہی ہیں گل وہی بلبل وہی نسیم صبا
وہی چمن ہے پہ وہ باغباں چمن میں نہیں
وہی ہے بزم وہی شمع ہے وہی فانوس
فدائے بزم وہ پروانے انجمن میں نہیں
رگوں میں خوں ہے وہی دل وہی جگر ہے وہی
وہی زباں ہے مگر وہ اثر سخن میں نہیں
نفاق و جہل نے ہندوستان کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں
ہے رنگ آنکھ کو محسوس اور دماغ کو بو
وہ شے جو اصل میں گل ہے کہیں چمن میں نہیں

(چکبست)

# جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کی پیرہن میں
حسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی
لے آئی جسکو قدرت خلوت سے انجمن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں
پروانہ اِک پتنگا، جگنو بھی اِک پتنگا
وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا
(اقبال)

---

# سرگزشت آدم

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بُھلایا قصۂ پیمانِ اولیں میں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو

دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے
ملا مزاج تغیّر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے
نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے
کبھی میں ذوقِ کلیمی میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آفریں میں نے
سنایا ہند میں آ کر سرودِ ربانی
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے
دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے
بنایا ذرّوں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے
لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے بیکارِ عقل و دیں میں نے
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقلِ دور بیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو
بنا دی غیرتِ جنّت یہ سرزمیں میں نے
مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہ نگیں میں نے
ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اُسے مکیں میں نے

---

(اقبال)

# مثنویات

## دنیائے فانی

سنو اے عزیزان ذی ہوش و عقل
کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل

پیمبر ہے، شہ ہے، کہ درویش ہے
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے

یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں
جہاں جملہ ہے ایک بزم رواں

جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش
یہ منزل نہیں جائے بود اور باش

گدا ہو کہ ہو شاہ عالی تبار
تہ خاک سب کا ہے دار القرار

نہ یک بوے خوش ہی ہوا ہو گئی
وہ رنگینیٔ باغ کیا ہو گئی

ملے خاک میں جھڑ کے گلہائے تر
پریشاں ہوئے مرغ گلشن کے پر

پتنگوں نے گر خاک مسکن کیا
چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا

گئی خاک دامن فشانی کے ساتھ
رہا آب سو بھی روانی کے ساتھ

نہ جدول رہے گی نہ سرو رواں
گلستاں کو پاویں گے ہو کا مکاں

زمیں کا رہے گا یہی کیا سبھاو
لپٹ جائیں گے آسماں جیسے تاو

سکوں یاں کا دیکھا سراسر شتاب
چلے جاتے ہیں کوہ جیسے سحاب

جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب
نہیں جائے باش اور جا ہے عجب

بھلا جی کے جانے کا کیا ہے بیاں  عیاں ہے کہ کہتے ہیں جاں کو رواں
جوانی گئی موسم شیب ہے  شہود ایک دو روز کو غیب ہے
گیا شور سر سے جھکا ہے بہت  گئی وا سد اب دل رہا ہے بہت
وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام  مزا کچھ نہیں ہو چکی صبح و شام
بلا ارتعاش تن زار ہے  ہر اک عضو چلنے کو تیار ہے
ہوا حافظہ بسکہ نسیاں کا صرف  نہیں یاد آتا ہے دو شنبہ حرف
ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے  کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے
نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے  سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے
نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ  کسے ذوق صحبت کہاں ہے دماغ
نہ رکھئے جو عینک نہ آوے نظر  کہے تو کہ اعمیٰ ہیں ہم بے بصر
صد افسوس لطف سماعت نہیں  صدا دور سے جیسے آوے کہیں
شباب آہ داغ جگر دے گیا  قد خم زمیں کی طرف لے گیا
جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی  سفیدی مو سے سحر ہو گئی
جو یہ حال ہے جا رہے ہیں ہم اب  دموں پر غرض آ رہے ہیں ہم اب
کھڑے ہوں تو تھرّائے ران اور ساق  جئیں بیٹھیں کیونکر کہ جینا ہے شاق
جو بازو ہیں اپنے سو بازو نہیں  اگر منہ کو دیکھو تو وہ رو نہیں
بدن کی ہوئی میری صورت ہی اور  وے آنکھیں نہیں ہے نہ چیتون کے طور
جسد ناتواں جائے مہماں تنگ  سخن منہ پہ آوے وداعی کے رنگ
شکن جلد میں دل کو پژمردگی  غریزی حرارت میں افسردگی
چھڑکتا رہوں منہ پہ میں آب کاش  کہ ہو نار ہے روح کا انتعاش
وگرنہ دیا سا بجھا جائے ہے  پھر اٹھ بیٹھوں تو جی جلا جائے ہے

سبہ روئے شیب اک ستم کر گیا لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا
قلم رکھ دے کر میرؔ ختم کلام تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام
(میر تقی میرؔ)

# "فراقِ یار"

کوئی صحبت خوشی کی بھاتی نہیں کوئی بزمِ طرب خوش آتی نہیں
انبساط و خوشی کرے ہے داغ گر ہنسوں بھی تو جوں ہنسے ہے چراغ
جمع جتنا ہو عیش کا اسباب دل کو اتنا کرے جلا کے کباب
گر یہ تقریب راگ ہوتا ہے سینہ یک لخت آگ ہوتا ہے
راگ ہر یک جدا ہیں گو بیشک پر اثر میں ہیں اب بھی دیپک
حضرت درد کی بنائے خیال کیا کہوں کیا کرے ہے دل کا حال
تان ہر ایک جان لیتی ہے تھہ لذت دلوں کو دیتی ہے
بولوں کا لطف جان سے ہے جدا ہے دل و جاں ہر طرح سے فدا
خیر تقریب جو کہ ہوتی ہے ہر طرح میری جان کھوتی ہے
جس قدر ہوئے صحبتِ رنگیں اس قدر دل کو اب کرے رنگیں
ہے تماشا کدھر کہاں کی سیر خوشی ہوتی ہے کوئی تیرے بغیر
مارتی ہے ہوائے ابر و بہار کچھ الٹ ہی گیا ہے لیل و نہار
جو کبھو آسمان پر ابر ہوا دل یہ بے اختیار جیسے ہوا
تیر باراں کرے ہے اب باراں کاٹے کھاتی ہے صحبتِ یاراں
مینہ جو برسات کا برستا ہے دل ملاقات کو ترستا ہے

جس گھڑی مینہ کی بال بندھ گئی ہو جھڑی
تار باندھے ہے آنسوؤں کی لڑی

جب یہاں ابر گھر کے جھکتا ہے
دل گھٹا آ گئے خوب رکتا ہے

اچھی لگتی نہیں ہے فصل بہار
لے اڑ جاتی ہے دل سے صبر و قرار

کوئی موسم بھلا نہیں لگتا
دیوے ہر ایک رت جدا ایذا

خواہ گرمی ہے خواہ جاڑا ہے
دل کو ہر ایک نے اجاڑا ہے

روپ گرمی کا اور گرماوے
دل میں وحشت زیادہ تر لاوے

قہر ہے گرمیوں کی دوپہریں
دلپہ کیا کیا گذرتی ہیں پہریں

کیا ہی جاڑے کی رت دکھاتی ہے
سرد مہری تری رت دکھاتی ہے

سخت دو بھر ہیں جاڑے کی راتیں
اور اس کی ہزار ہا باتیں

رات تو ہے یہ دن بھی کیا کم ہے
سانس ٹھنڈی ہر آن ہر دم ہے

اب نہ دن ہی کٹے نہ رات کٹے
کس طرح عرصۂ حیات کٹے

رات کاٹے کوئی کہ دن کاٹے
بات بنتی نہیں ہے بن کاٹے

عمر یوں کاٹے کسکو بھاتا ہے
بس یہ دن رات کاٹے کھاتا ہے

ہے شب ماہ دل پہ یوں پیارے
جیسے گھوڑے کو چاندنی مارے

گر گزر سوئے باغ ہوتا ہے
سینہ جل جل کے داغ ہوتا ہے

گر نظر جا پڑے سوئے گلزار
داغ ہوتا ہے دل بیاد عذار

آگ دل میں لگائے آتش گل
سانپ کی طرح کاٹے ہے سنبل

پھول لگتے ہیں جیسے انگارے
گر ز آتش نہال ہیں سارے

راہ تکتی ہیں آنکھیں نرگس کی
کیا کہوں آہ اور کس کس کی

یہ درختوں کے پات ہلتے ہیں
یا بافسوس ہاتھ ملتے ہیں

ہر طرف آبشار رووے ہے
سر ٹیک ڈاڑھیں مار رووے ہے

مثل آئینہ دیکھا کر کے خوض
غرق حیرت کھڑا ہے آب حوض

بلبلے اس میں آنکھ کھولے ہیں
کہ رخ آب پر پھپھولے ہیں

نہیں نرگس پہ یہ پڑی شبنم
چشم پُر آب ہیں سبھی از غم

نہیں سبزہ چمن میں خوابیدہ
تیرہ بختاں پڑے ہیں غلطیدہ

گل کبھی کرتے ہیں گریباں چاک
اور اُن پر نسیم ڈالے ہے خاک

سوچ میں غنچے ہیں گرفتہ دل
باغباں آپ کو کھڑے ہیں خجل

کیا بلا اب کے ناگہاں آئی
موسم گل ہی میں خزاں آئی

پر خزاں بھی نہ ایسی ہوتی تھی
رونق باغ یوں نہ کھوتی تھی

سخت عبرت کدہ یہ باغ ہوا
تختۂ گل ہے داغ داغ ہوا

دیکھ کر یہ چمن کا آب و رنگ
اور خاطر گرفتہ ہو دل تنگ

سرو پر جب نگاہ جاتی ہے
یاد میں قد کے آہ آتی ہے

کیا کہوں باغ کا جو عالم ہے
ہر شجر یاں تو نخل ماتم ہے

صرف اس باغ پر ہی اب کیا ہے
ساری ماتم سرائے دنیا ہے

جس طرف کو نگاہ کرتا ہوں
نعرہ بھرتا ہوں آہ کرتا ہوں

عشق تیرے کا دل کو داغ لگا
دیکھ تو بھی نیا یہ باغ لگا

(میر اثر)

# چاندنی اور باغ

نظر آئی واں چاندنی کی بہار — کہ آنکھوں نے کی خیرگی اختیار
در و بام یک لخت سارے سپید — ہر اک طاق و محراب صبحِ اُمید
بلوریں دھرے ہر طرف سنگ فرش — کہ جس سے منور رہے رنگِ فرش
ہر اک سمت واں نور کا ازدہام — لگے آئینہ قدِ آدم تمام
لبالب وہ جو بڑی پاکیزہ نہر — بڑے چشمۂ ماہ سے جس میں لہر
لبِ نہر پر صاف جو غور کی — تو سیڑھی سی تھی وہ ایک بلور کی
بڑے اس میں فوارے چھٹتے ہوئے — ہوائیں وہ موتی سے لٹتے ہوئے
مُقَرَّض پڑا اس میں مقیش جو — گرا آ کے واں رشک سے پرزے ہو
لئے گود مقیش چھوٹے بڑے — ہر اک جا ستارے اُڑا دیں کھڑے
غرض اپنی صورت سے تاروں کو توڑ — زمیں کو فلک کا بنایا تھا جوڑ
ہوائیں وہ جگنو سے چمکیں بہم — بلیں جلوۂ مہ کو زیرِ قدم
فقط چاندنی میں کہاں طور یہ — کہ طرہ نہ جب تک ملے اور یہ
زمانہ درخشاں ہوا درفشاں — زمیں سے لگا تا سماں درخشاں
کھڑا ایک نمگیرۂ آب دار — کہ بٹنے جس کے جھالر پہ موتی نثار
جڑاؤ وہ استادے الماس کے — ڈھلے ایک سانچے کے اک راس کے
کھچی ڈور ہر سمت زر تار کی — لڑی جوں کناری کی ہوں ہار کی
کہوں کیا میں جھالر کی اس کی پھبن — کہ سورج کے ہو گرد جیسے کرن

مُغرّق بچھی مسند اک جگ مگی
کہ تھی چاندنی جس کے قدموں لگی
نہ پھولے سماتے تھے تکیہ دھرے
کہ تھے وہ فقط حسن ہی سے بھرے
زمیں نور کی آسماں نور کا
جدھر دیکھو اودھر سماں نور کا
چمن سارے داؤ دیوں سے بھرے
جوانان گشبو کے ہر جا پرے
ستاروں کا مہتاب میں حال یوں
کہ جوتے میں پانی کے قطرے ہوں جوں
اگر کیجیے سایہ اوپر نگاہ
تو ہے وہ بھی جوں سایۂ مہر ماہ
کرے ہے نگہ جس طرف کو گذر
بجز نور آتا نہیں کچھ نظر

---

# محفل رقص و سرود

ہوا حکم گوری کا جو بر ملا
لئے ساز اپنے سبھوں نے اُٹھا
دیا آسماں پر جو طبلوں کو کھینچ
ہر اک تھاپ میں دل لیا سب کا کھینچ
لگی گانے ٹھیٹہ وہ اس آن سے
نکلنے لگی جان ہر تان سے
عجیب تان پڑتی تھی انداز سے
کہ بیکل تھی ہر تان آواز سے

غرض کیا کہوں اس کا میں ماجرا
عجب طرح کی بندھ گئی تھی ہوا
وہ گانے کا عالم وہ حسن بہار
وہ گلشن کی خوبی وہ دل کا سماں
گھڑی چار دن باقی اسوقت تھا
سہانا ہر اک طرف سایا ڈھلا
درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ
وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ
گلابی سا ہو جانا دیوار و در
درختوں سے آنا شفق کا نظر

وہ سرو سہی اور آب رواں — وہ مستی سے پانی کا بہنا وہاں
وہ اُڑتی سی نوبت کی دھیمی صدا — کہیں دور سے گوش پڑتی تھی آ
وہ رقصِ بتاں اور ستھرا الاپ — وہ گوری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ
وہ دل چھینا ہاتھ پر دھر کے ہاتھ — اُچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ
نہ انساں ہی کا ہو دل اس میں بند — ہوئے محو سن کر چرند اور پرند
غرض جو کھڑے تھے کھڑے رہ گئے — اڑے جس جگہ کو اڑے رہ گئے
جو پیچھے تھے آگے نہ وہ چل سکے — جو بیٹھے سو بیٹھے نہ پھر ہل سکے
لگی دیکھنے آنکھ نرگس اُٹھا — گلوں نے دیے کان اودھر لگا
لگے ہلنے آ وجد میں سب درخت — کھڑے رہ گئے سرو ہو کر کرخت
درختوں سے گرنے لگے جانور — بنے مثلِ آئینہ دیوار و در
بندھا اس طرح کا جو اس جا سماں — ہوا سب کے دل کا عجب حال واں

عجب راگ کو بھی دیا ہے اثر
کہ ہو جائے پتھر کا پانی جگر

میر حسن

---

# گل بکاولی

گل چیں نے وہ پھول جب اُڑایا — اور غنچۂ صبح کھل کھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاولی خوش اندام
جاگی مرغِ سحر کے غل سے — اُٹھی نگہت سی فرشِ گل سے

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پُر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل
جھنجلائی کہ کون دے گیا جل

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون؟
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو گل اُڑا نہیں ہے

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
بے گانہ تھا سبزے کے سوا کون

شبنم کے سوا جو آنے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پتلی وہی چشم حوض کا تھا

گل چیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار! پڑا نہ تیرا چنگل
مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

او باد صبا ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سونگھا پتا نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے
گل تو مہک سنگھا کدھر ہے

لرزاں تھی زبس یہ دیکھ کہرام
تھی سبزہ سی راست مو براندام

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اس کا غرض لگا بدلنے
گل برگ سے کف لگی وہ ملنے

گل کا سا لہو بھرا گریباں
سبزہ کا سا تار تار داماں

دکھلا کے کہا سمن پری کو
اب چین کہاں بکاولی کو

تھی بسکہ غبار سے بھری وہ
آندھی سی اُٹھی ہوا ہوئی وہ

ہر باغ میں بھولتی پھری وہ
ہر شاخ میں جھولتی پھری وہ

جس تختہ میں مثل باد جائی
اس رنگ کے وہ گل نہ پائی

بیوقت کب بوٗ کچھ ملا ہے
پتّہ کہیں بے حکم ہلا ہے

(نسیم)

# مرد ہو تو کسی کے کام آؤ

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک
کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ
اور بھائی تمہارے ہیں نادار
نوکروں کی تمہارے جو ہے غذا
جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو
کھاؤ تو پہلے تو خبر ان کی
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر
سب کو ہے ایک اصل سے پیوند
جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ
تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو
تندرستی کا شکر کیا ہے بتاؤ؟
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر

اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
ورنہ کھاؤ، پیو، چلے جاؤ
دل کو دکھ بھائیوں کا یاد دلاؤ
گرد دامن سے تا گریباں چاک
ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
ان کو وہ خواب میں نہیں ملتا
واں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو
جن پہ بیتا ہے نیستی کی پڑی
ہے کوئی عمر ان میں خشک اور کوئی تر
کوئی آزردہ ہے کوئی خورسند
تیرنے والو! ڈوبتوں کو تراؤ
لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو
رنج بیمار بھائیوں کا بٹاؤ
نہ کسی ہموطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو | بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو | سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد | شہر ہیں اتفاق سے آباد
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی | اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ | لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی | جو نہ آئی تھی وہ بلا آئی
پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے | ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا | کبھی درانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا | کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی | ایک شائستہ قوم مغرب کی

ملک روندے گئے ہیں پیروں سے
چین کس کو ملا ہے غیروں سے

حالی

# مسدّسات

## نمودِ صبح

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح　　ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح　　ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں　　چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار بن گلِ مہتاب پر خزاں　　مرجھا کے گر گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں
دکھلا کے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ نور کا ظہور　　یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور　　خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو ملک آسماں پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زباں پر

وہ سرخیِ شفق کی ادھر چرخ پر بہار　　وہ بار ور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار　　پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار

نافے کھلے ہوئے تھے گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

---

# حضرت عباسؑ کی جنگ

نکلا وہ شیر خیمہ سے باہر علم لئے
مجرے کو آئی فتح سپاہِ حشم لئے
جرأت نے بڑھ کے بوسۂ تیغ دودم لئے
نصرت نے چومے ہاتھ ظفر نے قدم لئے
خورشید کا جلال نگاہوں سے گر گیا
اقبال سر کے گرد ہما بن کے پھر گیا

وہ دبدبہ وہ سطوتِ شاہانہ وہ شباب
تھرا رہا تھا جسکی جلالت سے آفتاب
وہ رعبِ حق کہ شیر کا زہرہ ہو آب آب
صولت میں فرد دفترِ جرأت میں انتخاب
صورت میں سارے طور خدا کے ولی کے ہیں
شوکت پکارتی ہے کہ بیٹے علی کے ہیں

پہنچے جو دشتِ کیں میں اُڑاتے ہوئے فرس
گھوڑے کو ہاتھ اٹھا کے یہ آواز دی کہ بس
دیکھیں صفیں جمی جو چپ و راست پیش و پس
نعرہ کیا کہ نہر پہ جانے کی ہے ہوس
روکے گا جو وہ موت کے پنجے میں آئے گا
ہٹ جاؤ سب کہ شیر ترائی میں جائے گا

بولے یہ بڑھ کے فوجِ مخالف کے پہلوان
دیکھا نہیں کبھی کہ ہٹے لشکرِ گراں
یاں سب ہیں روم و شام کے جنگ آزما جواں
ہاں آئیے تو کھینچ کے تیغِ شررفشاں
لودے نہیں ہیں کچھ جو نگہباں ہیں گھاٹ کے

سر پھینک دینگے نہر میں خنجر سے کاٹ کے

سنتے ہی یہ جلال میں آیا علی کا لال — نعرہ کیا کہ تم ہمیں روکو گے کیا مجال
یہ مورچے ہیں کیا ہمیں جنکا ہو کچھ خیال — اک دم میں چیونٹیوں کی طرح ہوگی پائمال
بھاگوگے پھینک پھینک کے تیغیں لڑائی سے
لو مرد ہو تو اب نہ سرکنا ترائی سے

روکے ہمیں نکل کے جو طاقت کسی میں ہو — لے تیغ میاں سے جو شجاعت کسی میں ہو
گرمائے رخش کو جو حرارت کسی میں ہو — آئے جو جرأت ضرب کی قدرت کسی میں ہو
دو ہاتھ میں علی کے پسر وار پار ہیں
دریا نہیں کہ رک گیا ہم ذوالفقار ہیں

تم کیا پہاڑ بیچ میں گر ہو تو ٹال دیں — شیروں کو ہم ترائی سے باہر نکال دیں
مہلت نہ ایک کو دمِ جنگ و جدال دیں — پانی تو کیا ہے آگ میں گھوڑے کو ڈال دیں
منہ دیکھتے رہیں جو نگہباں ہیں گھاٹ کے
لے جائیں گھر پہ تیغ سے دریا کو کاٹ کے

سرکش ہیں سب ہماری زبردستیوں سے زیر — دادا شجاع باپ اولوالعزم، خود دلیر
جب رن پڑا ہے کر دئیے ہیں زخمیوں کے ڈھیر — لائے ہیں جا کے آگ سے پانی خدا کے شیر
عفریت بھاگتے ہیں وہ چوٹیں ہماری ہیں
بیرالعلم میں کود کے تلواریں ماری ہیں

جرأت جلو میں رہتی ہے نصرت رکاب میں — بنتے ہیں گھاٹ نہر کے تیغوں کی آب میں
لکھے ہوئے ہیں شیروں کے حملے کتاب میں — فصلیں ہیں اپنے زور کی خیبر کے باب میں
ناصر ہیں بادشاہِ فلک بارگاہ کے
دفتر اُلٹ دیے ہیں عرب کی سپاہ کے

بے مشک کے پھرے ہیں آتا ہے حسینؑ کب — گرمی میں پیاس سے کئی بچے ہیں تشنہ لب
اصغر[1] کو گودیوں میں تڑپتے کٹی ہے شب — کیا وقت ہے حسینؑ کے بچوں پہ ہے غضب
لالے پڑے ہوئے ہیں سکینہ[2] کی جان کے
کانٹے مجھے دکھائے تھے سوکھی زبان کے

یہ ذکر تھا کہ فوج کی جانب سے تیر آئے — نیزے اٹھا کے شمر کے منہ پر شریر آئے
یہ بھی جھپٹ کے مثلِ شہ قلعہ گیر[3] آئے — گیتی ہلی غضب میں جناب امیر آئے
گھوڑا اڑا پروں کو سواروں کے توڑ کے
لپکی صفوں پہ سیف بھی کاٹھی کو چھوڑ کے

آمد تھی تیغ کی کہ اجل کا پیام تھا — یہ صف اخیر تھی وہ رسالہ تمام تھا
بجلی سا ہر جگہ فرس تیز گام تھا — ششدر تھی موت چار طرف قتل عام تھا
اس غول پر کبھی تھی کبھی اس قطار پر
پڑتا تھا ایک تیغ کا سایہ ہزار پر

وہ تیغ کی چمک وہ تڑپ راہوار کی — رف رف[4] کی اک شبیہ تو اک ذوالفقار کی
شوکت سوار میں شہ دُلدُل سوار کی — حملوں میں شان تھی اسدِ کردگار کی
چتون وہی غضب وہی بیباکیاں وہی
پھرتی وہی جھپٹ وہی چالاکیاں وہی

توڑا یہ مورچہ وہ صف الٹی ادھر پھرے — تلوار خون میں آپ پسینے میں تر پھرے

---

۱؎ حضرت امام حسینؑ کے ایک ششماہی بچہ کا نام تھا وہ بھی کربلا میں تیر سے شہید کیا گیا۔
۲؎ حضرت امام حسینؑ کی چار سالہ صاحبزادی
۳؎ شہ قلعہ گیر اور جناب امیر سے مراد حضرت علی سے ہے جنھوں نے قلعہ خیبر فتح کیا تھا۔
۴؎ اس سواری کا نام ہے جس پر رسول خدا معراج کی شب سوار ہوئے تھے ۱۲

یوں خاک پر گرا کے لعینوں کے سر پھرے　　جیسے شکار کھیلے ہوئے شیر نر پھرے
تھی قہر کی نگاہ غضب کا جلال تھا
آنکھیں بھی سرخ سرخ تھیں چہرہ بھی لال تھا

منہ پھر گئے سپاہ کے جس سمت رُخ کیا　　یاں آئے واں گئے اِسے مارا اُسے لیا
باقی رہے ہزار میں دس سو میں اک جیا　　اللہ رے دم لہو یہ لہو تیغ نے پیا
اس پر بھی تشنگی میں نہ تسکین ذری ہوئی
گویا تھی آگ پیٹ میں اسکے بھری ہوئی

بیشک تھا ان کا ہاتھ امیر عرب کا ہاتھ　　پہنچا وغا میں سو طرف اک تشنہ لب کا ہاتھ
آئی اجل اٹھا جو کسی بے ادب کا ہاتھ　　شبیر خدا کے شبر نے مارا غضب کا ہاتھ
بازو پہ آئی تیغ دو دم شانہ کاٹ کے
پہنچے کو بھی قلم کیا دستانہ کاٹ کے

جب بڑھ کے سن سے صورت تیغ علی چلی　　ثابت ہوا کہ ضربت دست ولی چلی
دل پر خفی چلی تو گلوں پر جلی چلی　　تن سے نکل کے روح پکاری چلی چلی
دی تیغ نے صدا کہ ارادہ کدھر کا ہے
جلائی موت چل یہی رستہ سقر کا ہے

سارے رسالدار تباہی میں بڑھ گئے　　اب منہ کیسے دکھائیں کہ چہرے بگڑ گئے
نامی جو تھے جوان قدم اُن کے اُکھڑ گئے　　بھاگے جو سب نشاں بھی خجالت سے گڑ گئے
علموں کے پاس ڈھیر پھریرے جو رن میں تھے
ریتی پہ بیرقیں تھیں کہ مردے کفن میں تھے

نہ وہ علم سیاہ نہ وہ روسیاہ تھے　　تیغ و سپر بھی پاس نہ تھی بے پناہ تھے
بے سر تھے وہ جو فوج میں صاحب کلاہ تھے　　سب چھاؤنی اجاڑ محلے تباہ تھے
دکھلا دیا تھا خالق اکبر کے قہر کو

گویا غنیم لوٹتا پھرتا تھا شہر کو

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سپاہِ لعیں ہٹی　　یہ صف سوئے یسار وہ سوئے یمیں ہٹی
سر کے حباب، نہر کہیں سے کہیں ہٹی　　دہشت سے آسماں ہوا اونچا زمیں ہٹی
بھاگڑ پڑی کہ ایک سے اِک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتیِ گردوں پہ چڑھ گیا

اللہ ری جنگِ شیرِ نیستانِ کربلا　　چیونٹی بھی مورچوں میں نہ تھی آدمی تو کیا
پہنچے ترائی میں تو یہ اعدا کو دی صدا　　کیوں اب یہ نہر کس کی ہے اے قوم اشقیا
اِک دم میں ہم شکست ہزاروں کو دیتے ہیں
دیکھو اسد ترائی کو یوں چھین لیتے ہیں

رستے کھلے ہوئے ہیں کہاں ہے وہ بند و بست　　کس نے یہ روم و شام کی فوجوں کو دی شکست
کیا ہو گئے ترائی سے وہ سب ہوا پرست　　کیوں سربلند کون ہے اس وقت کون پست
فوجوں میں یوں کسی نے بھی گھوڑے اُڑائے ہیں
دیکھو تو ہم کہاں سے کہاں لڑ کے آئے ہیں

دنیا جو اک طرف ہو تو ہم پر ظفر نہ پائے　　فاقوں میں شیر بھی ہو مقابل تو منہ کی کھائے
کس دبدبہ سے جوہرِ تیغِ علی دکھائے　　اب کچھ الم نہیں اجل آئے کہ جان جائے
بس ہم نے گھاٹ چھین لیا مشک بھر چکے
مَردوں نے جو زباں سے کہا وہ کر چکے

لب تشنہ تین دن سے ہیں اور ہے فرات پاس　　چاہیں اگر تو ہاتھ بڑھا کر بجھا لیں پیاس
پر زہر ہے بغیرِ شہِ آسماں اساس　　مرتے ہیں آبرو پہ جوانانِ حق شناس
آقا کی تشنگی پہ جگر چاک چاک ہے
بے اُنکے آبِ خضر بھی گر ہو تو خاک ہے

(انیسؔ)

# حضرتِ علی اکبر کی شہادت

جس دم سنی حسینؑ نے یہ جاں گزا صدا — صابر اگرچہ تھے پہ کلیجہ اُلٹ گیا
ہاتھوں سے دل کو تھام کے دوڑے برہنہ پا — نعرہ کیا کہ ای علی اکبر کدھر گیا
مکر غریب و بیکس و تنہا سے جا بچو
آئے ضعیف باپ تو دُنیا سے جائیو

ہے ہے مرے شفیق پسر مہرباں پسر — خوشرو پسر سعید پسر، قدرداں پسر
مادر کا چین، باپ کا آرامِ جاں پسر — کم گو پسر، شہید پسر، نوجواں پسر
مقتل کدھر ہے کوئی بتاتا نہیں مجھے
اے نورِ عین کچھ نظر آتا نہیں مجھے

مجھ کو غریب دشتِ بلا کہہ کے پھر پکار — اکبار یا شہ دوسرا کہہ کے پھر پکار
اے شبر سید الشہدا کہہ کے پھر پکار — صدقہ ہو باپ یا ابتا[ل] کہہ کے پھر پکار
میری بھی جان تن سے تری ساتھ جائیگی
مرجاؤنگا ہمیں جو نہ آواز آئے گی

کچھ ہوش دست و پا کا نہیں بیحواس ہوں — زخمی ہے قلب کشتۂ اندوہ و یاس ہوں
غمگیں ہوں مردہ دل ہوں حزین و اُداس ہوں — دم توڑو تم تو ہے غضب اور میں نہ پاس ہوں
کیونکر قرار آئے دلِ ناصبور کو
لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کے آنکھوں کے نور کو

---

ل - باپ

دوڑے یہ بات کہہ کے جو سلطانِ بحر و بر　　بیٹے کی لاش باپ نے دیکھی لہو میں تر
اُٹھا یہ دل میں درد کہ خم ہو گئی کمر　　دیکھا جو زخم منہ کے قریب آ گیا جگر
تڑپے جو گر کے اور تڑپ کر ٹھہر گئے
غل پڑ گیا صفوں میں کہ شبیر مر گئے

ہوش آیا تین ساعت کامل کے بعد جب　　دیکھا کہ مرٹ رہی ہے شبیہہ رسول[1] اب
آنسو بہا کے رکھ دیے بیٹے کے لب پہ لب　　چلاتے تھے کہ چھوڑ چلے ہم کو ہے غضب
دل میں ہے گلے لپٹنے کی حسرت نکال دو
باہیں اُٹھا کے باپ کی گردن میں ڈال دو

اکبر نے آنکھیں کھول کے دیکھا رخِ پدر　　گالوں پہ اشک آنکھوں سے ٹپکے ادھر اُدھر
فرمایا شہ نے زانو پہ رکھ کر سرِ پسر　　روتے ہو کس کے واسطے اے غیرتِ قمر
یاں سے اُٹھا کے آلِ پیمبر میں لے چلیں
غم ماں کا ہے تو آؤ تمہیں گھر میں لے چلیں

کی عرض مہلت اتنی کہاں اے شہِ امم　　اب کیجئے قبلہ رو کہ نکلتا ہے تن سے دم
دولت ملی کہ دیکھ لیے آپ کے قدم　　جز رنجِ غمِ فراق مجھے کچھ نہیں ہے غم
ساتھ آئے تھے جو چاہنے والے وہ دور ہیں
روتا ہوں اس لیے کہ اکیلے حضور ہیں

شہ نے کہا مرے لیے بیٹا نہ روؤ بس　　ہو گا جہاں سے جانے میں تھوڑا سا پیش و پس
دنیا کی آرزو ہے نہ جینے کی کچھ ہوس　　میرے لیے ہے اب دمِ خنجر ہر اک نفس
اکبر ترے الم سے جگر چاک چاک ہے
جب تو نہ ہو تو باپ کے جینے پہ خاک ہے

---

[1] حضرت علی اکبر کی شکل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ملتی تھی [2] اُمت کے بادشاہ یعنی امام حسین

یہ بات سن کے لینے لگا ہچکیاں پسر
سوکھی زباں دکھائی کہ پیاسا ہوا ہے دل
زردی اجل کی چھا گئی چہرے پہ سر بسر
دو بار لی کراہ کے کروٹ ادھر ادھر
دُنیا سے انتقال ہوا نورِ عین کا
ہنگام ظہر تھا کہ لٹا گھر حسینؑ کا

(انیس)

# غمخواری بنی نوع انسان

بہت مخلص اور پاک بندے خدا کے
نشاں جن سے قائم ہیں صدق و صفا کے
نہ شہرت کے خواہاں نہ طالب ثنا کے
نمایش سے بیزار دشمن ریا کے
ریاضت سب انکی خدا کے لئے ہے
مشقت سب انکی رضا کے لئے ہے

کوئی ان میں ہے حق کی طاعت پہ مفتوں
کوئی نام حق کی اشاعت پہ مفتوں
کوئی زہد و صبر و قناعت پہ مفتوں
کوئی پند و وعظ و جماعت پہ مفتوں
کوئی موج سے آپ کو ہے بچاتا
کوئی ناؤ ہے ڈوبتوں کی تراتا

بہت نوع انساں کے غمخوار و یاور
ہوا خواہِ ملت بد اندیش کشور
شدائد کے دریائے خوں میں شناور
جہاں کی پر آشوب کشتی کے لنگر
ہر اک قوم کی ہست و بود اُن سے ہویاں
سب اس انجمن کی نمود اس سے ہے یاں

کسی پر ہو سختی صعوبت ہے اُن پر
کسی کو ہو غم رنج و کلفت ہے ان پر
کہیں ہو فلاکت مصیبت ہے ان پر
کہیں آئے آفت قیامت ہے اُن پر

کسی پر چلیں تیر آماج یہ ہیں
لٹے کوئی رہ گیر تاراج یہ ہیں

یہ ہیں حشر تک بات پر اڑنے والے — یہ پیماں کو میخوں سے ہیں جڑنے والے
یہ فوجِ حوادث سے ہیں لڑنے والے — یہ غیروں کی ہیں آگ میں پڑنے والے
اُمنڈتا ہے رُکنے سے اور ان کا دریا
جنوں سے زیادہ ہے کچھ اِن کا سودا

جمانے ہیں جب پاؤں ہٹتے نہیں یہ — بڑھا کر قدم پھر پلٹتے نہیں یہ
گئے پھیل جب پھر سمٹتے نہیں یہ — جہاں بڑھ گئے بڑھ کے گھٹتے نہیں یہ
مہم بن کے اُسر نہیں بیٹھتے یہ
جب اُٹھتے ہیں اُٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ

خدا نے عطا کی ہے جو ان کو قوت — سمائی ہے دل میں بہت اس کی عظمت
نہیں پھیرتی ان کا منہ کوئی زحمت — نہیں کرتی زیر انکو کوئی صعوبت
بھروسے پہ اپنے دل و دست و پا کے
سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے

نہیں مرحلہ کوئی دشوار ان کو — ہر اک راہ ملتی ہے ہموار ان کو
گلستاں ہے صحرائے پُرخار ان کو — برابر ہے میدان و کہسار ان کو
نہیں حائل ان کے کوئی رہ گذر میں
سمندر ہے پایاب ان کی نظر میں

اسی طرح یاں اہل ہمت ہیں جتنے — کمر بستہ ہیں کام پر اپنے اپنے
جہاں کی ہے سب دھوم دھام انکے دم سے — فقیر اور غنی سب طفیلی ہیں ان کے
بغیر ان کے بے ساز و ساماں تھی مجلس

نہ ہوتے اگر یہ تو ویراں تھی مجلس

زمیں سب خدا کی ہے گلزار انہیں سے — زمانے کا ہے گرم بازار انہیں سے
ملے ہیں سعادت کے آثار انہیں سے — کھلے ہیں خدائی کے اسرار انہیں سے
انہیں پر ہے یہ کچھ فخر ہے گر کسی کو
انہیں سے ہے گر ہے شرف آدمی کو

انہیں سے ہے آباد ہر ملک و دولت — انہیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملت
انہیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت — انہیں کی ہے سب ربع مسکوں میں برکت
دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
ان ہی کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

انہیں کا اُجالا ہے ہر رہ گذر میں — انہیں کی ہے یہ روشنی دشت و در میں
انہیں کا ظہورا ہے سب خشک و تر میں — انہیں کے کرشمہ ہیں سب بحر و بر میں
انہیں سے یہ رتبہ ہے آدم نے پایا
کہ سر اس سے روحانیوں نے جھکایا

ہر اک ملک میں خیر و برکت ہے اُن سے — ہر اک قوم کی شان و شوکت ہے اُن سے
نجابت ہے ان سے شرافت ہے ان سے — شرف ان سے فخر ان سے عزت ہے ان سے
جفاکش بنو گر ہو عزت کے خواہاں
کہ عزت کا ہے بھید ذلت میں پنہاں

مشقت کی ذلت جنہوں نے اُٹھائی — جہاں میں ملی اُن کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی — فضیلت نہ عزت نہ فرماں روائی
نہال اس گلستاں میں جتنے بڑے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

نہ بونصر تھا نوع میں ہم سے بالا　　نہ تھا بوعلی کچھ جہاں سے نرالا
طبیعت کو بچپن سے محنت میں ڈالا　　ہوئے اس لئے صاحبِ قدر والا
اگر فکرِ کسبِ ہنر تم کو بھی ہو
کہیں پھر ابونصر اور بوعلی ہو

(حالی)

# وقت کی قدر

وہ بے مول پونجی کہ ہے اصلِ دولت　　وہ شائستہ ملکوں کا گنجِ سعادت
وہ آسودہ قوموں کا راس البضاعت　　وہ دولت کہ ہے وقت جس سے عبادت
نہیں اس کی وقعت نظر میں ہماری
یونہی مفت جاتی ہے برباد ساری
اگر ہم سے مانگے کوئی ایک پیسہ　　تو ہوگا کم و بیش بار اس کا دینا
مگر ہاں وہ سرمایہ دین و دنیا　　کہ ایک ایک لمحہ ہے انمول جس کا
نہیں کرتے خست اڑانے میں اس کے
بہت ہم سخی ہیں لٹانے میں اس کے
اگر سانس دن رات کے سب گنیں ہم　　تو نکلیں گے انفاس ایسے بہت کم
کہ ہو جس میں کل کے لئے کچھ فراہم　　یونہیں گذرے جاتے ہیں دن رات پیہم
نہیں کوئی گویا خبردار ہم میں
کہ یہ سانس آخر ہیں اب کوئی دم میں

گڈریے کا وہ حکم بردار کتا — کہ بھیڑوں کی ہر دم ہے رکھوالی کرتا
جو ریوڑ میں ہوتا ہے پتہ کا کھڑکا — تو وہ شیر کی طرح پھرتا ہے بھپرا
گر انصاف کیجے تو ہے ہم سے بہتر
کہ غافل نہیں فرض سے اپنے دم بھر

حالی

---

# جلوۂ صبح

جب زنگِ شب آئینۂ ہستی سے ہوا دور — ہنگامِ سحر کون و مکاں ہو گئے پُر نور
تبدیل ہوئی صورت کوہِ شبِ دیجور — چمکا وہ تجلیِ سحر بے صفتِ طور
بجلی کی طرح چرخ پہ نورِ سحر آیا
آنکھوں کو نہ پھر خرمنِ انجم نظر آیا
تھی نور میں تفریح تو نور ارض و سما میں — سرگرمی بلشر میں تھی بشر یاد خدا میں
تھی تازگی خنکی میں تو خنکی تھی ہوا میں — شادابی تھی نکہت میں تو نکہت تھی صبا میں
خورشیدِ منور کا دمِ جلوہ گری تھا
نورِ رخِ مہتاب چراغِ سحری تھا
دریائے فلک میں تھا عجب نور کا عالم — چکر میں تھا گرداب صفت نیرِ اعظم
اُٹھتی تھیں شعاعوں کی جو موجیں وہ شرر دم — سیارے حبابوں کی طرح مٹتے تھے پیہم
تھی شورشِ طوفانِ سحر غرب سے تا شرق
آخر کو سفینۂ مہ گردوں کا ہوا غرق
والشمس تھا کندہ شہ خاور کی نگیں پر — واللیل کا باقی تھا نشاں بھی نہ کہیں پر

تھی مہر کی پھیلی جو ضیا چرخِ بریں پر
آنے لگا رہ رہ کے وہی نور زمیں پر
ذرّوں کو ستارا ابھی چمکتا نظر آیا
پیمانۂ خورشید چھلکتا نظر آیا

وہ صبح کا عالم وہ چمن زار کا عالم
مرغانِ ہوا نامہ زنی کرتے تھے باہم
ہنگام سحر بادِ سحر چلتی تھی پیہم
آرام میں سبزہ تھا تہِ چادرِ شبنم
ہر سمت بندھی نغرۂ بلبل کی ہوا تھی
غنچوں کی نسیمِ سحری عقدہ کشا تھی

جو نخل تھا گلشن میں برومند کھڑا تھا
دامانِ سحر میں گُلِ خورشید پڑا تھا
کیا خوب مقدر چمنستاں کا لڑا تھا
ہر گل پہ گہر قطرۂ شبنم کا جڑا تھا
بلبل کہیں طاؤس کہیں گھوم رہے تھے
مستوں کی طرح نخلِ چمن جھوم رہے تھے

مرغانِ چمن عالمِ مستی میں سحر دم
وصفِ چمن آرائے جہاں کرتے تھے باہم
شاخیں تھیں کہیں گردنِ تسلیم صفت خم
تسبیحِ خدا میں ہمہ تن محو تھی شبنم
غنچوں کو بھی تھی وردِ زباں حمد خدا کی
آتی تھی چٹکنے میں صدا صلِّ علیٰ کی

وہ پیشِ نظر وادیِ ایمن کا تماشہ
ہر شاخ و شجر میں شجرِ طور کا نقشا
تھا آتشِ گل میں اثرِ برقِ تجلّا
مدہوش تھے مرغانِ ہوا صورتِ موسیٰ
شکلِ یدِ بیضا تھی ہر اک شاخ نظر میں
اعجاز کا گل تھا کفِ گلچینِ سحر میں

رونق پہ دمِ صبح تھا خمخانۂ عالم
تھم تھم کے ہوا چلتی تھی سردی بھی تھی کم کم
پیمانۂ مہتاب تھا لبریز سحر دم
تھا جام صبوحی کا لیے نیّرِ اعظم

گردوں پہ شفق کی بھی عجیب جلوہ گری تھی
مینائے فلک میں مے گل رنگ بھری تھی
(چکبست)

# خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے — دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل رواں ہے — اللہ رے زیبِ زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے ہیں جاری — چین و عرب کی جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری — چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیِ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو — سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو — سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سُور بیر[۵] اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا انکی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے ابتک ان کا اثر عیاں ہے — اپنی رگوں میں ابتک انکا لہو رواں ہے
ابتک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے — فردوس گوش ابتک کیفیتِ اذاں ہے

---

۵ بزرگ اور بہادر

کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ ابتک
شوکت سے بہ رہا ہے دریائے گنگ ابتک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں     کرتے ہیں رقص ابتک طاؤس جنگلوں میں
ابتک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں     پستی سی آگئی ہے ہر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا     دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا     اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حُبّ قومی اس خواب سے جگا دے     بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے     اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حبّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک     رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک     ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا     آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا     ملتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو     مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

(چکبست)

# رامچندر جی کی ماں سے رخصت طلبی

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام — راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام — دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ — نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ — لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھونے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا — افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا — وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا
دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں — میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں — لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہونگی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیجدوں

دُنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سفید — اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی اُمید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید — سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید
ہلکی کیا حیات ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کیواسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم — ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بنکے مجھے شوکت و حشم — تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال — دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نو نہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال — آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں ان سے جوگ لیا جن کیواسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کیواسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئینگے نظر — گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر — یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اُجڑ گیا

سرزد ہوا تھا مجھ سے خدا جانے کیا گناہ — منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ — اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالق عالم بحل[1] کرے

---

[1] معاف

آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سنکر زباں سے ماں کی یہ فریاد دردخیز — اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز — لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بیکس گذر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادر ناشاد کے حضور — مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالم پیری میں ہے ضرور — لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر — ہوتا جو ہے سب اسکے بہانے ہیں سر بسر
اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر — کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اسکی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اُسے ہے کوئی جانتا نہیں

رحلت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار — واجب ہر ایک رنگ میں ہی شکر کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار — ماتم کدے ہیں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اُٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانہ نے انقلاب — جن سے کہ بیگناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوز دروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب — پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جنکا ہر گھڑی — قائم تھیں جن کے دم سے اُمیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اڑکر نہیں پڑی — ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گل ہوئے رنگ حیات سے
انکو جلا کے خاک کیا اپنے ہات سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال — ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گذرتے ہی ماہ و سال — خود دل سے دردِ ہجر کا ٹلتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار — کرتا ہے اسکو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انسان گناہگار — یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام — بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شادکام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام — قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں — ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انہیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں — وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انہیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار — موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار

دیکھو یہ قدرت چمن آرائے روزگار　　　وہ ابر و باد و برق ہیں رہتے ہیں بیقرار
ہوتا ہے اُنپہ فضل جو ربّ کریم کا
موج سموم[1] بنتی ہے جھونکا نسیم کا
اپنی نگاہ ہے کرم کار ساز پر　　　صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہربان گر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر[2]　　　رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بیخبر
اسکا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامان دشت دامن مادر سے کم نہیں

(چکبست)

# ابرِ کوہسار

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا　　　ابر کہسار ہوں گُل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا　　　شہر و ویرانہ مرا بحر مرا، بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو
مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے درخشاں ہونا　　　ناقۂ شاہد رحمت کا حدی خواں ہونا
غمزدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا　　　رونق بزم جوانان گلستاں ہونا
بن کے گیسو رخ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجہ صرصر سے سنور جاتا ہوں

---

[1] زہریلی ہوا۔ [2] گھر

دور سے دیدۂ اُمید کو ترساتا ہوں — کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جو آتا ہوں — بالیاں نہر کو گرداب کو پہناتا ہوں
سبزۂ مزرعِ نوخیز کی اُمید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں پروردۂ خورشید ہوں میں
چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے — اور پرندوں کو کیا محوِ ترنم میں نے
سر پہ سبزے کے کھڑے ہو کے کہا قُم میں نے — غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

---

اقبال

# رباعیات

## انیسؔ

(۱)

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو — آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگِ جاں سے ہے اُس پر یہ بعد — اللہ اللہ! کس قدر دور ہے تو

(۲)

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

(۳)

دُنیا دریا ہے اور ہوس طوفاں ہے — مانند حباب ہستیٔ انساں ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس بادِ مراد — سینہ کشتی ہے ناخدا ایماں ہے

(۴)

گر لاکھ برس جئے تو پھر مرنا ہے — پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے — غافل! تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

(۵)

آغوش لحد میں جبکہ سونا ہوگا — جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا

تنہائی میں آہ! کون ہووےگا انیس
ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہوگا

(۶)

اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے
لے زاد سفر کوچ کی تیاری ہے
مر مر کے پہنچتے ہیں مسافر واں تک
یہ قبر کی منزل بھی عجیب بھاری ہے

(۷)

پرساں کوئی کب جوہر ذاتی کا ہے
ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا
رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

---

## دبیر

(۱)

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہوں
منہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بار گنہ نے بیدل
تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

(۲)

بندوں پہ کرم حضرت باری کا ہے
مقدور کسے شکرگزاری کا ہے
دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجھ کو
ثمرہ یہ نہال خاکساری کا ہے

(۳)

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے
قد سرو کو گل کو رنگ و بو دیتا ہے
بیکار تشخص ہے تصنع بے سود
عزت وہی عزت ہے جو تو دیتا ہے

(۴)

دنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا
کس کس کا نہ یاں ہم نے زمانا دیکھا

برسوں رہا جن کے سر پہ چتر زریں — تربت پہ نہ ان کی شامیانہ دیکھا

(۵)

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا — قطرہ جو گہر ہوا عدن سے نکلا
تکمیل کمال کی غربت ہی ہے دلیل — پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

# حالیؔ

(۱)

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا — حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور — بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

(۲)

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا — آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے — انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

(۳)

ہستی ہے ہے تیری رنگ و بو سب کے لیے — طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لیے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور — سب اپنے لئے ہیں اور تو سب کے لیے

(۴)

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی — بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہمکو چھوڑا — ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

(۵)

پیری نہیں منزل فنا ہے گویا — اب کوچ کا وقت آ لگا ہے گویا
یوں جسم سے ہو گئی حرارت کافور — اک راکھ کا ڈھیر رہ گیا ہے گویا

(۶)

دُنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو
رو داد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

(۷)

حالی کو جو کل فسردہ خاطر پایا
پوچھا باعث تو ہنس کے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی امید
وہ وقت گئے اب اور موسم آیا

(۸)

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام انکو جلدی بھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

(۹)

بس بس کے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں
گڑ گڑ کے علم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں
آج اسکی ہے نوبت تو کل اسکی باری
بن بن کے یونہی کھیل بگڑ جاتے ہیں

(۱۰)

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بد اے فرزند
ایک آدھ ادا اُن کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہیں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

(۱۱)

جو کرتے ہیں کچھ زباں سے کہتے ہیں وہ کم
ہوتے نہیں ساتھ جمع دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حسنِ گفتار
بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

(۱۲)

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو
کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سن لو
افسانۂ قیس و کوہ کن یاد نہیں
چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

(۱۳)

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغامِ بُکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے

(۱۴)

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان
برسات میں سبزے کا نہ تھا جس پہ نشاں
پایوں کے تھے جن کے جو تنے سے دہقاں
یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

(۱۵)

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب سے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

---

# اکبر الہ آبادی

(۱)

خاطر مضبوط، دل توانا رکھو
اُمید اچھی خیال اچھا رکھو
ہو جائیں گی مشکلیں تمہاری آساں
اکبر اللہ پر بھروسا رکھو

(۲)

دنیائے دنی کی یہ ہوس جانے دو
گلچیں ہو اگر تو خار و خس جانے دو
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ
اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

(۳)

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو
اللہ سے نیک اُمید رکھنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبرؔ
بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

(۴)

رکیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

(۵)

دُنیائے دنی محل آفات بھی ہے
فکر روزی محل اوقات بھی ہے
طرّہ اُس پہ یہ کہ مرنا بھی ضرور
جیتا رہے آدمی تو ایک بات بھی ہے

(۶)

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعال مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبرؔ نے سنا ہے اہل غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

(۷)

آزاد سے دین کا گرفتار اچھا
شرمندہ ہو دل میں وہ گنہگار اچھا
ہر چند کہ زور بھی ہے اک خصلت بد
واللہ کہ بے حیا سے مکّار اچھا

(۸)

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزّت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بے کار
مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

(٩)

ہو علم اگر نصیب، تعلیم بھی کر — دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو — جو اہل ہیں اسکے اُنکی تعظیم بھی کر

(١٠)

ہر اک کو نوکری نہیں ملنے کی — ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھ — عزت کے لیئے کافی ہے آدل نیکی

(١١)

اے جدّ بزرگ کے نواسو! پوتو — تزئین کو نہ کرو زمینیں جوتو
کیا رٹتے ہو اپنی ہسٹری کو ہر وقت — اللہ مدد کرے گا ویسے ہو تو

(١٢)

تعلیم بھی پائی رب کے پیارے بھی ہوئے — دنیا کو بھی خوش کیا ہمارے بھی ہوئے
لیکن جو یہ نورِ طبع پایا نہ گیا — پھر کیا تم عرش کے جو تارے بھی ہوئے

(١٣)

اس عہد میں یہی ہے بس داخلِ نکوئی — مذہب پہ نکتہ چینی ملّت پہ عیب جوئی
شوقِ عمل نہیں ہے فکرِ اجل نہیں ہے — ناصح بنے ہیں اکثر عابد نہیں ہے کوئی

(١٤)

دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے — لذّت وہ ہے کہ جوشِ صحت سے ملے
ایماں کا ہو نور دل میں وہ راحت ہے — عزت وہ ہے جو اپنی ملت سے ملے

(١٥)

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی — اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ — موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

# اقبال

(۱)

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے — بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

(۲)

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر — حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نان جویں بخشی ہے تو نے — اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

(۳)

جوانوں کو مری آہ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نور بصیرت عام کر دے

(۴)

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے — کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی — اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

(۵)

زمانہ کی یہ گردش جاودانہ — حقیقت ایک تو باقی فسانہ
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا — فقط امروز ہے تیرا زمانہ

(۶)

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

(۷)

چمن میں رختِ گل شبنم سے تر ہے
سمن ہے، سبزہ ہے، بادِ سحر ہے
مگر ہنگامہ ہو سکتا نہیں گرم
یہاں کا لالہ بے سوزِ جگر ہے

(۸)

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

# قصائد

## تشبیب قصیدۂ بہاریہ

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر اک
دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عزوجل

قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
ڈال سے پات تلک پھول سے لیکر تا پھل

واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ
آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

بخشتی ہے گُلِ نورستہ کی رنگ آمیزی
پوشش چھینٹ قلمکار بہر دشت و جبل

عکسِ گُل بن پہ زمیں پر ہے کہ جھکے آگے
کار نقاشئ مانی ہے دوم وہ اول

تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

بار سے آبِ رواں عکس ہجومِ گُل کے
لوٹے ہے سبزے پہ از بسکہ ہوا ہے بیکل

شاخ میں گُل کی نزاکت بہم پہنچی ہے
شمع ساں گرمئ نظارہ سے جاتی ہے پگھل

جوشِ روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاوِ زمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل

دمِ عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک
دین میں قسمِ جمادات سے شاید ہو خلل

فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی
کہیں دعوائے خدائی نہ کریں لات و ہبل

حدِ ایام کہ پیش اب مددِ نامیہ سے
بچہ مرغِ چمن تخم سے آتا ہے نکل

سبز ہوتا ہے فصیحی کے سبب سے ہر بار
جو زباں سے سخن اب طوطی کے آتا ہی نکل

دست گل خوردہ و شاخ گل و گلزار بہم ۔۔۔ بجہاں نشو نما کرنے میں ہیں ضرب مثل
غنچہ پر کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ ۔۔۔ گل بہم پہنچے ہے عقدہ ہو کسی طرح کا حل
آ دبے ہے انکی نظر لاکھ طرح کا وہ پھول ۔۔۔ اُن گلوں جھپٹ جو نگہ کے ہیں سدا مستقل
یاسمن رنج جو رکھتی ہے خزاں سے مانا ۔۔۔ چاہتی ہے بسماجت کرے سبزے سے بدل
چشم نرگس کی بصارت کی زبس ہی درپے ۔۔۔ غنچۂ لالہ نے سرمے سے بھری ہے مکحل
اس قدر محو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح ۔۔۔ چشم بیدار گلستاں میں جھپکتی نہیں پل
آب جو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے ۔۔۔ خط گلزار کے صفحے پہ طلائی جدول
سایہ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر ۔۔۔ سباغ لال میں جوں تیغ زمرد کو جل
سنگ نے رتبۂ آئینہ کیا ہے پیدا ۔۔۔ تیغ کہسار ہوئی ہے بسکہ ہوا سے صیقل
برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے ۔۔۔ گل کو دیکھو تو نگہ جائے ہے سنبل پہ پھسل
لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم ۔۔۔ پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل
اتنی ہی کثرت لغزش بہ زمین ہر باغ ۔۔۔ جو ثمر شاخ سے اُترا سو گرا سر کے بل
فیضِ تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے ۔۔۔ شہد ٹپکے جو لگے نشتر زنبور عسل
دانہ جس شور زمیں میں نہ پھلا دہقاں سے ۔۔۔ سبز واں دانہ شبنم سے ہوا ہے جنگل
کشت کرنے میں ہر اک تخم سے از فیض ہوا ۔۔۔ گرتے گرتے بہ زمیں برگ و بر آتا ہے نکل
جوہری کو چمنستان جہاں میں (۲۱) فصل ۔۔۔ آ گیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل
تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی ۔۔۔ اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

# قصیدہ شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

میں حضرتِ سودا کو سُنا بولتے یارو
اللہ رے اللہ رے کیا نظمِ بیاں ہے

اتنا میں کیا عرض کہ فرمائیے حضرت
آرام سے کٹنے کی طرح کوئی بھی یاں ہے

سنکر یہ لگے کہنے کہ خاموش ہے رہ جا
اس امر میں قاصر تو فرشتے کی زباں ہے

کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے کی گئی شکل
ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالمِ بالا یہ نشاں ہے

گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کے خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنئے کے ہاں ہے

ثابت ہو جو ڈگلا، تو نہیں موزوں میں کچھ چال
تیروں میں ہے پر گبری تو بے چلّہ کماں ہے

کہتا ہے نفرغزہ کو صراف سے جاکر
بیوی نے، تو کچھ کھایا ہے فاقے سے بیاں ہے
یہ سُن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ
شوال بھی پھر ماہِ مبارک رمضاں ہے
اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے
تنخواہ کا پھر بیٹھنا اس شکل سے یاں ہے
لیتے ہیں بایں رو یہی وہ تو دو اک ماہ
ٹک دھونس دھڑکے کی جنھیں تابِ تواں ہے
اور وہ جو ہیں کمزور وہاں آن کے بیٹھیں
ریتی کے جو آگے کی یہ ہر ایک دکاں ہے
اُٹھ اُٹھ کے دکھاتے ہیں انہیں حال وہ اپنا
دربار دار اس عہد میں جو خورد و کلاں ہے
یوں بھی نہ ملا کچھ تو ہر اک پالکی آگے
اس بج سے رسالے کا رسالہ ہی رواں ہے
کوئی سر پہ کئے خاک گریباں کسی کا چاک
کوئی روتے ہے منہ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے
ہندو و مسلمان کو پھر اس پالکی اوپر
ارتھی کا تو ہے وہم جنازے کا گماں ہے
یہ مسخرگی دیکھ کے جا صاحب ارتھی
کرتے ہیں جو واں عرض تو، پھر ہے نہ ہاں ہے
گر ہو جئے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب

اس کی تو اذیت ہی بڑی آفتِ جاں ہے
وہ جاگے ہے راتوں کو تو بیٹھے ہیں دوزانو
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے
بے وقت خورش اس کی جو ہو اپنے تئیں بھوک
سو کیا کہوں تجھ سے کہ مصیبت کا بیاں ہے
گھڑ بال کی جب بیٹھے ہوئے گنتے ہیں گھڑیاں
اور رنج خلا رودوں میں جوں اسپِ دواں ہے
صیغے پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر
سو دو سو روپے کا جو کسی عمدہ کے ہاں ہے
صحبت ہے یہ اس سے اگر آقا کے تئیں چھینک
آوے ہے تو اس کو بخشونت نگراں ہے
دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اُس کے
ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اس وقت گماں ہے
اور ماحضر اوپر جو وہ نواب کو دیکھے
کھانا تو یہ کھاتے ہیں پر اسکو خفقاں ہے
مطبوخ میں ہے خربزہ اور خربزے پر دودھ
ہے دودھ پہ مچھلی تس اوپر گاؤزباں ہے
یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی سے ہو تسلی
اس سب پہ تفنن کے لئے بیسنی ناں ہے
اس بیں جو کہیں درد اٹھا پیٹ میں ان کے
پھر تو علی سینا ہے تو وہ ہیچمداں ہے

سوداگری کیجے تو ہے اس میں مشقت
دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجیے منزل
ہر شام بہ دل وسوسہ سود و زیاں ہے
ملے جا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس
یہ درد جو سنئے تو عجیب طرفہ بیاں ہے
قیمت جو چکاتے ہیں سو اسطرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ کہ درزی کا گماں ہے
جب مول مشخص ہوا مرضی کے موافق
پھر پیسوں کا جاگیر کے عامل پہ نشاں ہے
پروانہ لکھا کر گئے عامل کنے جس وقت
کہتا ہے وہ پیسہ ابھی مجھ پاس کہاں ہے
اودھر سے پھر آئے تو کہا جنس ہی لے جا
دیوان بیوتات یہ کہتے ہیں گراں ہے
آخر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس
ہر اک متصدی سے میاں اور تیاں ہے
ناچار ہو پھر جمع ہوئے قلعہ کے آگے
جو پالکی نکلے ہے تو فریاد و فغاں ہے
دو بیل لے جا کر جو کہیں کیجیے کھیتی!
اور مینہ بھی موافق ہی پڑے تو تو سماں ہے
ہیں خشکی و تری کے تفکر میں شب و روز

نے امن ہے دل کے تئیں نے جی کو اماں ہے
شاعر جو سنے جانتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
مشتاق ملاقات انھوں کا کس و ناکس
ملتا انھیں اُن سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دوگانہ
بابت قطعۂ تہنیت خانِ زماں ہے
ملّائی اگر کیجئے ملّا کی ہے یہ قدر
ہوں دو روپے اس کے جو کوئی مرثیہ خواں ہے
او ماحضر اخوند کا اب کیا میں بتاؤں
اک کاسۂ دالِ عدس و جو کی دو ناں ہے
دن کو تو بچارہ وہ پڑھایا کرے لڑکے
شب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے
تس پر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اُس کی
لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے
بھاگے یہ عمل کر جو وہ شیطاں کا لشکر
دوّال کو لے ہاتھ تعاقب میں دواں ہے
اب کیجئے انصاف کہ جس کی ہو یہ اوقات
آرام جو چاہے وہ کرے وقت کہاں ہے
جس روز سے کاتب کا لکھا حال ہیں تب سے
ہر صفحۂ کاغذ پہ قلم اشک فشاں ہے

دہ بیت تکے سبکڑے لکھنے کو ہے محتاج
خوبی میں خطِ اب جس کا بہ از خطِ بتاں ہے
یہ بھی میں تکلف سے ہی کہتا ہوں وگرنہ
آفاق میں اِن چیزوں کی اب قدر کہاں ہے
دمڑی کو کتابیں لکھیں دھیلے کو قبالہ
بیٹھے ہوئے واں میر علی چوک جہاں ہے
یاں فکرِ معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفِ سست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے

——— (سودا)

# قصیدے کی تشبیب

ہاں مہِ نو! سنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن رہا کہاں غائب
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا! اے سرورِ خاصِ خواص
حبذا اے نشاطِ عامِ عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جاوے اور آوے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام[1]

جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں
ایک ہی ہے اُمید گاہِ انام[2]

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اسکا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام[3]

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ
قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھ کو کیا پایا روشناسی کا
جز بہ تقریبِ عید ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

---

۱؎ چغل خور۔ ۲؎ دنیا کے لوگ ۳؎ سوال کے طور پر

میرا اپنا جدا معاملہ ہے  
اور کے لین دین سے کیا کام  
ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص  
گر تجھے ہے اُمید رحمت عام

---

# قصیدہ

صبحدم دروازۂ خاور کھُلا　　مہر عالمتاب کا منظر کھُلا  
خسرو انجم کے آیا صرف میں　　شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھُلا  
وہ بھی تھی اک کیمیا کی سی نمود　　صبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا  
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ　　دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا  
صبح آیا جانب مشرق نظر　　اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھُلا  
تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر　　بادۂ گلرنگ کا ساغر کھُلا  
لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے　　رکھدیا ہے ایک جامِ زر کھلا  
بزم سلطانی ہوئی آراستہ　　کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا  
تاج زریں مہر تاباں سے سوا　　خسرو آفاق کے منہ پر کھلا  
شاہ روشن دل بہادر شاہ کہ ہے　　مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا  
وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے　　عقدۂ احکام پیغمبر کھُلا  
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام　　اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھُلا  
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے　　واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھُلا  
توسن شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب　　تھان سے وہ غیرت صرصر کھُلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب تو کہے بت خانۂ آذر کھُلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کی منصبِ مہر و مہ محور کھُلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک میری حد وسع سے باہر کھُلا
تھا دل وابستہ قفل بے کلید کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھُلا
باغ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہ سخن گستر کھُلا

غالبؔ

---

# قصیدہ

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا
مثل نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موج صبا
بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار
بن گیا گلزار عالم رشک صد دار الشفا
ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر
شاخ اشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا
ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالہ بے داغ سیہ پانے لگا نشو و نما
ہو گیا زائل مزاج دہر سے یاں تک جنوں
بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
ہوتا ہے لطفِ ہوا سے اس قدر پیدا لہو
برگ میں ہر نخل کی سرخی ہے جوں برگ حنا

پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا
ہر مزاج بلغمی میں ہوئی ہے تولید خون
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے عجب
نام کو اشیاء میں نے تلخی رہی نے سمیت
بن گئی تریاک افیوں زہر میٹھا ہو گیا
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم
کیا عجب گر آبِ حنظل دیوے شربت کا مزا
نیش کی جوش ہے دنبالۂ زنبور میں
کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلہ
راحت و آرام کا اس دور میں ہے دَوردَور
چاہیے واقف نہ ہو دوران سر سے آ آیا
موتیا بند آنکھ میں اپنی جو رکھتی ہے صدف
اب رکھے ہے روشنی مثلِ دلِ اہلِ صفا
آ گیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج
تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا
نسخہ یہ لکھنے نہیں پاتا ہو الشافی طبیب
کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا
فرق چاہا یاں تک اعضائے بدن سے درد نے
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جدا
لاغروں کو ہو کمالِ تاب و طاقت یہ شباب

جیسے دو ہفتہ ہلال اک شب میں ہو بدرالدجیٰ
صبح صادق کے ہے گو سر میں سفیدی آ گئی
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا
بھوک کی شدت سے اسکو اک نفس فرصت نہو
قرص سے خورشید کے جبتک نہ کرلے ناشتا
اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگس بیمار کا
واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جبکہ ہو اس کی نوید غسل صحت جانفزا
وہ ولی عہد زماں مرزا محمد بوظفر
اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنادے اقویا
تقویت کا یہ اثر ہو عالم جو ہیں برگ زرد
ہوں مقوی دل و جاں مثل اوراق طلا
شادی صحت سے اس کے آج ہو کر شاد شاد
تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا

# قصیدہ

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال ابروئے پرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی

ہے عکس فگن جامِ بلوریں سے مے سُرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ میکش کے حنائی

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اُڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہو وے نہ ممیز کُرۂ ناری و مائی

خالی نہیں مے سے روِشِ دانۂ انگور
زاہد کا بھی ہر دانہ تسبیح ریائی

کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی
کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سائی

ہے نرگسِ شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل
برگِ گلِ سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

رخسارۂ گلچیں کا ہے سرخی سے یہ عالم
جوں وقتِ غضب چہرۂ ترکانِ خطائی

کیا ساغر رنگیں کو کیا جلد مہیا
نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی
ہوتی متحمل نہیں اک ساغر گل کی
شاخ گل احمر کی نزاکت سے کلائی
اعجاز نوا سنجی مطرب سے چمن میں
ہر خار کی ہے نوکِ زباں شعر نوائی
حیرت کی نہیں جائے کہ دیوار چمن پر
ہر طائرہ تصویر کرے نغمہ سرائی
شاہا ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق
عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی

---

(ذوقؔ)

# سوانح حیات

## میر امّن دہلوی

اصلی نام میر امان لیکن میر امّن کے نام سے مشہور ہوئے۔ آبا و اجداد سلطنت مغلیہ کے زمانے میں وظائف اور جاگیروں سے معزز و ممتاز تھے۔ احمد شاہ درّانی کے حملہ میں میر امّن کا گھربار تاراج ہوا۔ سورج مل جاٹ نے ان کی تمام جاگیریں ضبط کرلیں تو بے سرو سامانی کی حالت میں دہلی کو خیرباد کہہ کر پٹنہ چلے آئے اور کچھ عرصہ کے بعد کلکتہ چلے گئے۔ یہاں نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی میر کاظم کے اتالیق رہے۔ میر بہادر علی نے ان کا تعارف ڈاکٹر گلگرسٹ سے کرایا۔ اور ان ہی کے اشارے سے ۱۸۰۱ء میں امیر خسرو دہلوی کے قصہ چہار درویش کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور اسکا تاریخی نام "باغ و بہار" رکھا جو نہایت ہی مقبول ہوا

باغ و بہار کی زبان اس قدر سلیس، سادہ، صاف، اور با محاورہ ہے کہ بقول سر سید احمد خاں مرحوم "جو مرتبہ

میر تقی میر کو نظم میں حاصل ہے وہی میر امن کو نثر میں ہے۔"
باغ و بہار نہ صرف زبان و قصہ کے اعتبار سے دلکش و دلچسپ ہے بلکہ اس میں اہل مشرق کے رسم و رواج، عادات اور اطوار اور طرز معاشرت کی صحیح تصویریں ہیں۔

"باغ و بہار" کی زبان کے متعلق خود میر امن کا دعویٰ ہے کہ وہ دہلی کی مستند زبان ہے۔ چونکہ سو برس پہلے کی زبان ہے۔ اس لئے بعض ایسے الفاظ کی موجودگی جواب متروکات میں داخل ہیں قابل لحاظ نہیں۔ ان کا اسلوب تحریر سادگی اور صفائی کا نمونہ ہے۔

منتخبات کا پہلا مضمون "اردو کی کہانی" باغ و بہار کے دیباچے سے ماخوذ ہے۔ جس میں سبب تالیف کتاب، مصنف کے حالات زندگی اور اردو کی ایک مختصر سی تاریخ دی گئی ہے

---

# اسد اللہ خان غالب

مرزا اسد اللہ خاں نام۔ مرزا نوشہ لقب۔ نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ خطاب۔ پہلے "اسد" اور بعد میں "غالب" تخلص کرتے تھے۔ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۶ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب افراسیاب بادشاہ توران تک پہنچتا ہے۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں جب کہ مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا سمرقند سے ہندوستان آئے اور ایک فوجی عہدہ پر نوکر

ہوئے۔ غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں کچھ مدّت دربار اودھ میں رہے اور پھر نواب نظام علی خاں حیدرآباد دکن کی ملازمت اختیار کی۔ کچھ عرصہ بعد دکن سے آگرہ چلے آئے اور راجہ بختیاور سنگھ والی الور نے اپنے یہاں فوجی خدمت پر مامور کیا۔ اور وہیں ایک لڑائی میں کام آئے۔ اس وقت مرزا غالب کا پانچ برس کا سن تھا۔ چچا نصراللہ بیگ خاں نے پرورش کی۔ لیکن ابھی آٹھ برس کی عمر تھی کہ چچا کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ اور اس کے بعد مرزا کی تربیت ان کی نانہال میں ہوئی۔

مرزا غالب کو کمال کے ساتھ ساتھ تنگ دستی بھی قسام ازل سے ملی تھی۔ انہیں کبھی فارغ البالی نصیب نہیں ہوئی۔ آخر عمر تک تنگ دستی دم کے ساتھ رہی ۷۳ برس کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

مرزا غالب کا پایہ شاعری میں نہایت بلند ہے۔ مرزا جہاں فارسی نظم و نثر کے مسلم الثبوت استاد ہیں وہاں اردو نثر میں بھی ایک نئی طرز اور ایک نئے اسلوب کے موجد بیان کیے جاتے ہیں۔ ان کا انداز بیان سادہ، بے تکلف اور ایسا بیساختہ و برجستہ ہے کہ تحریر کے بجائے تقریر کا اور مراسلہ کے بجائے مکالمہ کا لطف آتا ہے

مولانا الطاف حسین حالی مرزا صاحب کی اردو نثر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے

خط وکتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے پوری پوری تقلید ہو سکی۔ انہوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو منز سلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا۔ مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں۔ سب اُڑا دیں۔ وہ خط کا کبھی میاں کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔"

---

# میر مہدی مجروحؔ

میر مہدی نام، مجروح تخلص، دہلی کے باشندے، میر حسین فگار کے فرزند اور مرزا غالب کے محبوب اور سب سے عزیز شاگردوں میں تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دہلی چھوڑ کر پانی پت چلے گئے۔ چند روز بعد تلاش معاش "الور" گئے اور کچھ مدت والی ریاست مہاراجہ شیر دھان سنگھ کے وظیفہ خوار رہے آخر عمر میں رام پور آئے اور نواب صاحب کے مصاحبین میں داخل ہو گئے۔ میر مجروح نہایت ہی خوش فکر شاعر تھے۔ زبان صاف، سلیس، سادہ، اور شیریں ہے گو کہ کلام میں غالب کا رنگ خیالات میں ندرت اور مضامین میں جدت نہیں مگر پھر بھی طرز ادا

استادانہ ہے۔

---

# ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی

مولوی نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں ضلع بجنور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والدماجد سید سعادت علی خاں سے ختم کر کے ۱۸۴۵ء میں قدیم دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ کالج سے نکل کر پنجاب میں مدرسی کی اور پھر کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ انگریزی زبان بقدر ضرورت سیکھ کر گورنمنٹ کے حکم سے تعزیرات ہند کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا اور اس صلہ میں کانپور کی تحصیلداری ملی اور رفتہ رفتہ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔

نواب محسن الملک اور نواب عماد الملک بلگرامی کی وساطت سے سر سالار جنگ نے ۱۸۷۷ء میں ان کو حیدر آباد طلب فرمایا۔ اور یہاں ایک معزز عہدے پر مقرر ہوئے۔ یہاں سے بعزت و احترام سبک دوش ہوکر دہلی تشریف لائے۔ ۲۔اپریل ۱۹۱۲ء میں اس دنیا سے سفر کیا۔

مولوی نذیر احمد اردو کے ایک بہت بڑے ادیب گزرے ہیں۔ اردو نثر نگاروں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی زبان دہلی کی ٹکسالی اردو کا بہترین مرقع ہے۔

آپ کی تحریر کی روانی اور دلچسپی ایک خاص درجۂ امتیاز رکھتی ہے۔ الفاظ، محاورات اور امثال کا بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی کتابیں اخلاقی و مذہبی معلومات کی مخزن اور ان کے ناول قوم و ملت کی اصلاح کے علم بردار ہیں۔ تعلیم نسواں پر بھی انہوں نے دلچسپ اور سبق آموز کتابیں لکھی ہیں۔ قرآن شریف کا بھی بہت ہی بامحاورہ اور فصیح ترجمہ کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد ایک زبردست مقرر بھی تھے۔

مراۃ العروس، توبۃ النصوح، فسانۂ مبتلا، بنات النعش، ابن الوقت۔ رویائے صادقہ وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

---

# مولوی محمد حسین آزاد

محمد حسین نام، آزاد تخلص اور شمس العلماء خطاب، ان کی ولادت ۱۸۳۱ء میں دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد باقر علی شرفائے دہلی میں سے تھے۔ مولانا باقر علی نے شمالی ہند میں اردو کا سب سے پہلا اخبار ۱۸۳۷ء میں بنام "اردو اخبار" جاری کیا۔ مولانا آزاد نے دہلی کالج میں عربی و فارسی کی تکمیل کی۔ آزاد کے والد اور خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق میں گہرے تعلقات اور دلی دوستی تھی۔ چنانچہ آزاد کی ابتدائی تعلیم و تربیت ذوق کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ اردو نظم و نثر لکھنے کی استعداد انکو کالج میں ہی حاصل ہو چکی تھی۔ اور

کالج کے امتحانوں میں سب طالب علموں سے اول رہتے تھے۔ مولانا آزاد نے شعر گوئی میں ذوق کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد یہ لاہور چلے گئے۔ اور سررشتۂ تعلیم میں نئی درسی کتابوں کی اصلاح پر مقرر ہوئے۔ یہیں سے ترقی کر کے اورینٹل کالج کے فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ ۱۸۸۶ء میں آزاد نے ایران کا سفر کیا۔ ۱۸۸۶ء میں ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ جوبلی کی تقریب میں ان کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۹۱۰ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔

اردو نثر نگاروں میں آزاد کی سب سے زیادہ نمایاں اور مقتدر شخصیت ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی ہستی بہت سی خصوصیات کی حامل تھی۔ بقول مصنف "داستان تاریخ اردو" آزاد کا مرتبہ موجد کا بھی ہے۔ نقاد کا بھی۔ صاحب طرز کا بھی۔ آزاد سب سے پہلے انشا پرداز ہیں۔ پھر مورخ، تذکرہ نویس، سیرت نگار۔ ان کی تحقیق و تنقید سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انکی انشا پردازی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بقائے دوام کے اعتبار سے آزاد بہ حیثیت انشا پرداز کے زندہ جاوید ہیں۔ زبان و بیان کی دلکشی میں انکی ہر کتاب سدا بہار گلزار ہے۔ مطالعہ و حوالہ کے لئے ان کی ہر کتاب مفید و ضروری ہے"۔

نثر میں آب حیات، نیرنگ خیال، دربار اکبری اور سخندان پارس آزاد کی نہایت مشہور و معروف کتابیں ہیں۔

☆

# مولانا الطاف حسین حالیؔ

مولانا الطاف حسین حالیؔ اردو زبان کے اعلیٰ درجے کے شاعر اور بلند پائے کے نثر نگار ہوئے ہیں۔ اردو شاعری میں مولانا نے عام روش سے ہٹ کر اپنی راہ الگ نکال لی اور اردو شاعری میں ایک بڑا انقلاب پیدا کر کے نیچرل اور قومی شاعری کی بنیاد رکھی مولانا کا طرز اسلوب نہایت دلکش اور سلیس، عبارت صاف اور زور دار ہے۔ مگر ان کے یہاں شبلی کا جوش، آزاد کا چٹ پٹا پن و رنگینی نذیر احمد سا زور و شور و ظرافت نہیں ہے۔ لیکن قوت بیان فصاحت و روانی بہتر سے بہتر ہے۔ مولانا محض لفاظی اور عبارت آرائی سے زیادہ نفس مضمون و مطلب کا خیال رکھتے تھے۔ آپ کی عبارت سلجھی اور رچی، صاف اور ستھری، تلی اور متین ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب بی اے فرماتے ہیں "حالی کی متین اور رچی تلی نثر اور تنقید نے اردو ادب میں ایسا اضافہ کیا ہے کہ جس کا اعتراف ہر صاحب ذوق کرتا ہے"۔

آپ کی ولادت ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت ہوئی ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء میں بعمر ۷۷ سال انتقال فرمایا۔ مولانا کی کتابیں نثر میں حیات جاوید یادگار غالب۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ حیات سعدی۔ نظم میں مسدس۔ مد و جزر اسلام، دیوانی حالی، شکوۂ ہند مثنویاں یادگار ہیں۔

***

# مرزا رجب علی بیگ لکھنوی

رجب علی بیگ نام اور سرور تخلص تھا۔ باپ کا نام مرزا اصغر علی تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ فارسی و عربی کی تکمیل کے بعد کتابت میں بھی سرور نے کمال حاصل کیا۔ اس فن میں مشہور خطاط حافظ محمد ابراہیم کے شاگرد ہوئے۔ علم موسیقی میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ شاعری میں آغا نوازش حسین نوازش، سے اصلاح لی۔ سرور اگرچہ شاعر تھے اور صاحب دیوان بھی مگر فن شاعری میں انہیں وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو نثر نگاری میں ہوئی۔ سرور نثر نگاری میں اپنے زمانے کے مسلم الثبوت استاد اور اپنے عہد کے ایک اچھے ادیب تھے۔ ان کی تمام تصانیف "فسانہ عجائب" سرور سلطانی۔ گلزار سرور۔ انشائے سرور، شگوفہ محبت۔ شبستان سرور۔ وغیرہ مسجع و مقفیٰ ہیں۔ گو مقفیٰ عبارت ان کے قبل ان کے عہد میں اور ان کے بعد بھی لوگوں نے لکھی ہے مگر جو شہرت و مقبولیت اس رنگ میں انہیں حاصل ہوئی۔ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی۔ غرض یہ حقیقت ہے کہ اس رنگ کے لکھنے والوں میں آج تک کوئی ان کا ہم پلہ و ہم پایا اردو زبان میں نہیں ہوا۔

ان کا انتقال ۸۲ برس کی عمر میں ۱۸۶۷ء میں ہوا۔ انہوں نے "فسانہ عجائب" کے دیباچہ میں میر امن دہلوی کے

دعوے زباں دانی پر طنز کیا ہے۔ وہ دبستانِ لکھنؤ کی ابتدائی نثر کی صفِ اول کے مصنفین میں شمار کیے جاتے ہیں۔

# مولانا شبلی نعمانی

شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے، باپ کا نام شیخ حبیب اللہ تھا۔ عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم مولوی شکر اللہ سے حاصل کی۔ مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی کی شاگردی و صحبت میں منطق و فلسفہ وادب پڑھا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی استادوں سے مختلف مقامات پر کسب علم کا سلسلہ عرصۂ دراز تک جاری رہا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں تمام درسیات ختم کر لیں۔ ۱۸۷۶ء میں مولانا حج کو چلے گئے۔ وہاں سے واپس آکر وکالت کا امتحان پاس کیا لیکن اس پیشے سے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ آخر ۱۸۸۲ء میں علیگڈھ چلے آئے۔ سر سید احمد خاں و حالی کی صحبت اور سر سید کے کتب خانے سے بڑا استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ پروفیسر آرنلڈ سے مغربی تنقید کے اصول اور فرنچ زبان سیکھی۔ مشرقی ادبیات کے نقائص اور کمزوریوں سے واقفیت حاصل کی۔ علی گڈھ میں شبلی کو اسلامی کارنامے قلم بند کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور سر سید نے ان کی ہمت افزائی کی۔ کالج کی ملازمت کے زمانے میں مولانا نے بلادِ اسلامیہ ترکی، مصر،

اور شام کا سفر کیا۔ اور وہاں سے آکر سفرنامہ لکھا جو بہت مقبول ہوا۔

سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد ۱۸۹۸ء میں شبلی نے کالج کی ملازمت چھوڑ کر اپنے وطن اعظم گڑھ میں قیام کیا۔ یہاں "الفاروق" کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ ۱۸۹۹ء میں کشمیر کا سفر کیا۔ وہاں بیمار ہو گئے۔ اور اسی بیماری میں الفاروق کی مشہور و معروف تصنیف کی تکمیل ہوئی۔ اسکے بعد مولانا حیدر آباد تشریف لے گئے۔ دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ناظم علوم و فنون کے عہدے پر مامور ہوئے۔ یہاں بھی مولانا کی سررشتۂ تعلیم کی اصلاح، تصنیف و تالیف اور اعلیٰ ادبی تحقیق و جد و جہد جاری رہی۔ اسی زمانہ میں انہوں نے "الغزالی"، سوانح مولانا روم۔ علم الکلام، موازنۂ انیس و دبیر، جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں۔ ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء قائم ہوا تو اس کے قیام و انتظام میں شبلی کا بہت بڑا حصہ تھا۔ ۱۹۱۳ء میں شبلی نے اپنے وطن اعظم گڑھ میں دار المصنفین قائم کیا اور اپنا مکان، باغ اور کتب خانہ اس کے لئے وقف کر دیا۔

۱۸۹۲ء میں سلطان ترکی نے شبلی کو تمغۂ مجیدیہ عطا فرمایا اور اسی زمانہ میں گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ وہ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔

شبلی کا انداز تحریر شستہ اور پرزور اور اسلوب بیان

نہایت دل نشین، سنجیدہ اور مدلل ہے۔ ان کی طبیعت نہایت ہمہ گیر مذاق صحیح اور طبع اسقدر لطیف ہے کہ ہر موقع و محل کے لحاظ کے لیئے اسی کے مناسب طرز تحریر اختیار کیا ہے۔ لطیف و نازک استعارے اور تشبیہیں اس خوب صورتی و برجستگی سے استعمال کرتے ہیں کہ عبارت میں دلکشی و دلاویزی پیدا ہوجاتی ہے۔ مضمون، الفاظ و استعارات کے سیاہ بادل میں چھپ کر نہیں رہ جاتا بلکہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا رہتا ہے۔ سرسید مرحوم مولانا کو ان کے طرز تحریر پر مبارک باد دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔" ایسی صاف اور شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہے" غرض مولانا کا انداز بیان کاروباری اردو کا وہ بے مثل نمونہ ہے جو کہ دور جدید کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

مولانا شبلی نعمانی ایک مورخ و ناقد کی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اسلامی تمدن کی توسیع و اشاعت میں بڑا حصہ لیا۔ مولانا کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کی قدیم شان و شوکت کی تاریخ کو طرز جدید میں پیش کیا۔ بقول ایم مہدی حسن صاحب مرحوم،" شبلی نے تاریخی سلسلہ میں جس قدر مذہبی لٹریچر پیدا کر دیا ہے وہ ہمارے لیئے کافی سے زیادہ ہے۔ خاص کر اس جدت کے لحاظ سے کہ شبلی نے ایک طرف تو "بڑے میاں" یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اُتاری اور ساتھ ہی ساتھ یورپ کے نوخیز چلتے پرزوں یعنی فلسفہ و سائنس

کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں جڑوائے بلکہ دونوں میں مصافحہ کرا دیا۔

# پنڈت رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ در نام، سرشار تخلص تھا۔ ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابھی صرف چار سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ابتدائے سن میں عربی اور فارسی کی تعلیم ختم کر کے کیننگ کالج لکھنؤ میں انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ شعر و شاعری سے پہلے ہی سے لگاؤ تھا۔ اب لکھنؤ کی فضا میں یہ شوق اور بڑھ گیا اور مظفر علی خاں اسیر سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد فکر معاش دامنگیر ہوئی تو چند سال تک انگریزی اسکولوں میں ماسٹری کرتے رہے۔ ۱۸۷۸ء میں سائنس کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ "شمس الضحیٰ" کے نام سے شائع کیا۔ پھر ۱۸۷۸ء میں منشی نولکشور نے انہیں اودھ اخبار کی ایڈیٹری کے لیے منتخب کیا۔ اسی اخبار میں "فسانۂ آزاد" کی بنیاد رکھی گئی۔ اور یہ قسط وار شائع ہوتے رہے۔ اس کے بعد الٰہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم مقرر ہوئے۔ لیکن بہت ہی جلد اس سے کنارہ کشی اختیار کر کے حیدر آباد دکن میں مہاراجہ کشن پرشاد کے سایۂ عاطفت میں جا رہے۔ یہاں رسالہ دبدبۂ آصفیہ

کے ایڈیٹر بھی رہے۔ حیدر آباد ہی میں ۱۹۰۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا
سرشار کا مرتبہ ایک ماہر زبان اور صاحب طرز کی حیثیت سے بہت بلند ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے ایک بڑے ادیب اور ایک ایسے اسلوب کے مالک تھے جو انہیں کا پیدا کردہ تھا۔ سرشار کا انداز بیان انوکھا۔ بے ساختہ اور دل آویز ہے۔ ان کی عبارت سلیس، دلکش، بامحاورہ اور پرزور ہے۔ ان کا طرز تحریر افسانہ نویسی کے لیے نہایت موزوں ہے۔ پلاٹ اور نفس مضموں سے زیادہ عبارت دلچسپ و دلکش ہوتی ہے بقول پنڈت بشن نرائن در "عبارت آرائی غضب کی ہے طرز ادا نہایت بے تکلف اور آسان، تازہ اور نیچرل، تمثیلی اور واضح پھر اس کے ساتھ جا بجا پر لطف ظرافت پھڑکتے ہوئے فقرے، مزیدار شوخیاں، ترکی بہ ترکی جواب، حماقت آمیز مضحک باتیں جن کو پڑھکر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہاں تکلف اور آورد بہت ہے لیکن سرشار کی عبارت رواں، بے تکلف اور واضح ہوتی ہے۔ سرور کے یہاں زیادہ تر اشیاء کا بیان ہے۔ سرشار کی تصانیف انسانوں کی جیتی جاگتی تصاویر سے مزین ہیں،،

سرشار نے اپنے عہد کی اسلامی اور خصوصاً لکھنؤ کی تہذیب کی جو صحیح تصویر کھینچی ہے اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور ان کے مطالعہ و غور و فکر پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

٭٭٭

# مولانا عبدالحلیم شرر

مولانا عبدالحلیم شرر ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے ان کے والد حکیم تفضل حسین عربی و فارسی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور واجد علی شاہ کے درباری طبیب تھے۔ جب واجد علی شاہ معزول ہو کر کلکتہ چلے آئے تو اُن کے والد بھی شرر کو اپنے ساتھ کلکتہ لے آئے۔ اسوقت شرر کی عمر تقریباً آٹھ سال کی تھی۔ یہاں اپنے والد سے ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے اسی زمانہ میں مولوی محمد حسین حیدر سے انگریزی تعلیم شروع کی۔ ان کے والد نے ۱۸۷۰ء میں انہیں لکھنؤ بھیجدیا۔ یہاں علامہ عصر حضرت مولانا عبدالحی صاحب سے درسیات ختم کیں ۱۸۷۹ء میں علم و حدیث کا شوق انہیں دہلی لے آیا اور یہاں مشہور محدث جناب مولوی نذیر حسین صاحب سے علم حدیث کی تکمیل کے بعد لکھنؤ واپس چلے آئے۔

۱۸۸۱ء میں شرر اودھ اخبار کے اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر ہوئے اور فلسفیانہ ادبی مضامین لکھنے لگے۔ اسی زمانہ میں "محشر" نام ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔

۱۸۸۷ء میں اودھ اخبار کی اڈیٹری چھوڑ دی اور اپنا رسالہ "دلگداز" جاری کیا۔ یہ رسالہ بہت جلد مقبول عام ہو گیا اور شرر عمر بھر اس کے ذریعہ سے تاریخ کی خدمت کرتے رہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد تشریف لے گئے۔ اور یہاں دو سو روپیہ ماہوار پر وقار الامرا کی ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸۹۳ء میں نواب صاحب کے صاحبزادے کے ساتھ انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں تین سال تک قیام رہا۔ اسی زمانہ میں فرانسیسی زبان بھی سیکھی۔ واپس آ کر "دلگداز" کو حیدر آباد سے جاری کیا۔ کچھ عرصہ بعد شرر حیدر آباد کی ملازمت ترک کر کے لکھنؤ واپس گئے۔ وہ آخری عمر تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے اس جہان فانی کو الوداع کہا۔

عبدالحلیم شرر اردو زبان کے ایک مشہور و معروف مصنف، مضمون نگار اور ناول نویس ہیں۔ ان کا اسلوب بیان سلیس و سادہ مگر پر زور ہے۔ فقروں کی بندش نہایت چست ہوتی ہے۔ ان کا طرز تحریر انشاپردازی کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ناول نویسی کو شرر نے وسعت دی اور اس میں ایک ادبی شان پیدا کی۔ تاریخ کو ناول کے سانچے میں ڈھالا اور انگریزی انشاپردازی کی خصوصیات کو اردو میں منتقل کرنے میں ایک حد تک کامیاب رہے۔ نثر میں شاعرانہ خیالات کا اظہار کرنا، تاریخی و عشقیہ ناولوں کو ایک دلچسپ پیرایہ میں ادا کرنا، قدرتی مناظر کی صحیح اور جیتی جاگتی تصویر کھینچنا انہی کا حصہ تھا۔ انسانی جذبات اور واردات پر اس قدر تصرف تھا کہ جس قسم کے جذبات چاہتے تھے اپنے ناول پڑھنے والوں کے

دل میں پیدا کرتے۔ ان کو اردو کا "اسکاٹ" کہا جاتا ہے وہ افسانہ میں تاریخ اور تاریخ میں افسانہ پیدا کرتے ہیں۔

ان کی حسب ذیل تصانیف قابل قدر ہیں :۔

عصر قدیم۔ تاریخ سندھ۔ ماہ ملک۔ ایام عرب۔ فردوس بریں رومۃ الکبریٰ۔ زوال بغداد۔ حسن کا ڈاکو۔ فتح اندلس وغیرہ۔

---

# راشد الخیری دہلوی

محمد عبدالراشد الخیری ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور یہیں پرورش پائی۔ یہ ابھی نو سال کے بھی نہ تھے کہ ان کے والد مولوی محمد واجد صاحب کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور عربی و فارسی کے فاضل ہوئے۔ ان کو تصنیف و تالیف کا شوق بچپن سے تھا۔ دلی کی ٹکسالی زبان پر انہوں نے قدرت حاصل کی۔ خواتین کی زبان کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔ انہوں نے نذیر احمد دہلوی کے نقش قدم پر چلنا اختیار کیا۔ اور انکی توجہ بھی عورتوں کی تعلیم و ترقی، ان کے مصائب زندگی کی طرف مبذول رہی اور ان کی تصانیف اسی ایک مقصد کے لئے وقف رہیں۔

ان کا اسلوب نہایت ہی صاف سلیس اور عام فہم ہے ان کی عبارت موثر ہوتی ہے ان کے لفظ لفظ سے حزن و ملال

اور رنج وغم ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے ناول صنف نازک کے دکھ درد، اور رنج والم کے ترجمان ہیں۔ اسی لئے اہل ملک نے انہیں "مصورِ غم" کا خطاب عطا فرمایا ہے۔

۶۷ سال کی عمر میں ۱۹۳۶ء میں انہوں نے رحلت فرمائی۔

# خواجہ حیدر علی آتش

خواجہ حیدر علی نام، آتش تخلص، دلّی کے رہنے والے تھے بچپن ہی میں ان کے والد خواجہ علی بخش کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد آتش نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ اگرچہ آتش خواجہ زادوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس میں مسند فقر بھی قائم تھی اور پیری مریدی کا سلسلہ تھا مگر آتش نے اس خاندانی طریقہ کو چھوڑ کر شاعری اختیار کی اور مصحفی کے شاگرد ہوئے مشق سے کلام کو اس درجہ بڑھایا کہ اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت استاد مانے گئے۔ سینکڑوں شاگرد ان کے دامن تربیت میں پرورش پاکر استاد کہلائے۔

یہ خاندانی اقتضا ہی کا نتیجہ تھا کہ آتش نے نہ تو اہل دول کی مدح میں کوئی قصیدہ لکھا اور نہ امرا کے درباروں میں ناشناس تحسین حاصل کرنے کے لئے غزلیں سنائیں۔ شاہ اودھ کے دربار سے اسی روپیہ ماہوار وظیفہ پاتے تھے اور اسی پر قناعت کی ۱۸۴۶ء

میں اس جہان فانی کو الوداع کہا۔

آتش نے غزل کے سوا اور کچھ نہیں لکھا۔ تمام عمر کی کمائی جسے حیات جاودانی کا مول کہنا چاہیے۔ ایک دیوان غزلوں کا ہے۔ جو کہ ان کے سامنے رائج ہو گیا تھا۔

آتش کے کلام میں ان کے تخلص کے اعتبار سے جوش اور گرمی بہت ہے۔ ان کا کلام تصنع اور تکلف سے پاک ہے جذبات محبت کو نہایت ہی موثر اور دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ زبان بہت مزیدار اور روزمرہ کی بول چال کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

بقول آزاد مصنف "آبِ حیات"۔ "جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورہ اردو کا دستور العمل ہے۔ اور انشا پردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اسی طرح وہ شعر کہہ دیتے ہیں۔ ان کے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی ہے"۔

# حکیم مومن خاں مومن

مومن خان نام، مومن تخلص، ۱۷۹۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد حکیم غلام نبی خاں شرفائے دہلی میں سے تھے۔ حضرت شاہ عبد القادر دہلوی سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر فن طب میں جو آبائی پیشہ تھا کمال حاصل کیا۔ علم نجوم میں بھی مومن کو ایسا ملکہ تھا کہ دور دور تک اس میں ان کا مد مقابل نہ تھا۔ شطرنج سے ان کو بہت مناسبت تھی شعر و شاعری سے مومن کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ مگر مومن نے شاعری کو کبھی ذریعے معاش نہیں بنایا۔ کبھی کسی امیر کی دربار داری نہ کی اور نہ کسی امیر کی مدح میں قصیدہ کہا۔

کوٹھے سے گر کر مومن کا بازو ٹوٹ گیا تو علم نجوم کی رو سے حکم لگایا کہ پانچ دن، ۵ ماہ یا پانچ برس میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ پانچ مہینوں ہی میں مر گئے۔

خود ہی تاریخ کہی:-

دست و بازو بشکست

۱۸۶۲ء

غزل مومن کا سرمایہ کمال ہے اور اسی بدولت آج وہ صاحب طرز اور مجتہد فن مانے جاتے ہیں۔ بقول پروفیسر ضیا (احمد ضیا) اردو شعرا میں مومن نفس تغزل کے اعتبار سے

جس نقطۂ عروج تک پہنچ گئے ہیں دوسروں کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں،،

مومن اسلوبِ ادا اور قدرتِ بیان کے بادشاہ ہیں انہوں نے شاعری میں کسی کی تقلید ہی نہیں کی بلکہ عام روش سے ہٹ کر بالکل الگ اپنا راستہ بنایا۔ ان کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لئے شہرۂ آفاق ہے۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں جو کلام میں ایک خصوصیت پیدا کر دیتے ہیں۔ عاشقانہ رنگ کے وہ استاد کامل ہیں۔ ان کے اشعار ترجمان وارداتِ دل ہوتے ہیں۔ ان کے اسلوب بیان میں ندرت اور تازگی ہوتی ہے۔ مومن کے رنگ تغزل پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی محمد حسین آزاد مصنف "آب حیات" فرماتے ہیں:۔

"ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں استعارہ اور تشبیہ کے زور سے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے۔ ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ہیں اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے۔ وہ اکثر اشعار میں ایک شئے کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذات شئے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لطیف لطیف معانی پنہاں پیدا کرتے ہیں۔ اکثر عمدہ ترکیبیں اور نادر تراشیدہ فارسی اور اضافتیں اردو میں استعمال کرتے ہیں"

حکیم مومن کے کلیات میں غزلوں کے سوا چند قصیدے چند مثنویاں اور ایک واسوخت بھی ہے جس میں درد اور اثر کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے۔ ان کی مثنویاں تیرو نشتر ہیں جن میں حرماں نصیب عاشق کے سوز محبت کا اظہار ہے وہ جذبات سے بھری ہیں اور مضطرب دلوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں

مومن مقطع میں اکثر اپنے تخلص سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنے تخلص کی مناسبت سے اکثر ایسے مضامین لاتے ہیں جو بہت ہی دلچسپ اور موزوں ہوتے ہیں۔ مثلاً ؎

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

---

# اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین نام، اکبر تخلص تھا ۱۸۴۶ء میں بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی فارسی و عربی کی تعلیم کے بعد علوم مغربی کی طرف توجہ کی۔ ۱۸۶۷ء میں وکالت کا امتحان درجۂ اوّل میں پاس کیا۔ ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار اور ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ کے مسل خواں مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد وکالت شروع کی اور ۱۸۸۰ء تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۸۰ء میں

دو بارہ سب جج اور ۱۸۹۴ء میں سشن جج ہو گئے۔ ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ نے ان کی خدمات کے صلہ میں خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔ ۱۹۰۳ء میں اکبر اپنے مستقل عہدۂ ججی سے نہایت نیک نامی کے ساتھ پنشن لے کر علٰحدہ ہوئے اکبرؔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا۔

اکبر کا ابتدائی کلام زیادہ تر صنف غزل میں ہے جو حسن و عشق گل و بلبل مے و ساقی کے شوخ مضامین سے مالا مال ہے۔ ان غزلوں کا وہی رنگ ہے جو قدیم میں برتا جاتا ہے۔ بعد میں اکبر نے اس رنگ قدیم کو ترک کر کے اردو شاعری اور غزل گوئی میں اپنا راستہ آپ بنایا اور ایک نئی جگہ پیدا کی۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ قدیم رنگ کی غزل گوئی گھٹتی جاتی حقایق و فلسفہ بڑھتا جاتا ہے۔ اب اشعار بالکل سیاسی، اخلاقی اور روحانی رنگ میں رنگے جاتے ہیں اسی رنگ میں وہ واقعات حاضرہ مغربی تہذیب و تمدن پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اکبر کی خاص شہرت، ان کی ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف طنزیات پر مبنی ہے۔ جو ان کی نظمیں، رباعیات اور قطعات میں آب دار موتیوں کی طرح چمک رہی ہیں۔ ان کی ظرافت محض ایک تمسخر ہی نہیں بلکہ اس کی تہ میں نہایت لطیف و عمیق معنی کے علاوہ ایک اخلاقی تعلیمی، سیاسی، معاشرتی یا ادبی

حقیقت پنہاں ہوتی ہے۔ بقول سید سلیمان صاحب ندوی میر صاحب اپنی شیر و شکر میں پند و موعظت اور نصیحت گری کی ان تلخ دواؤں کا گھونٹ گلے سے اتار دیتے ہیں۔ جن کو یوں پینا اس جدید دور لطافت و تنزہ پسندی میں ناممکن تھا۔

میر صاحب بھری محفل میں علمائے کرام، مشائخ عظام امراء و حکام۔ مدعیان رہبری عام اور نو جوان تعلیم یافتوں کا خاکہ اُڑاتے ہیں اور ان کی چتون پر میل نہیں آتا۔"

غرض اکبر کا کلام صفائی زبان اور طرز ادا کی شگفتگی کا اچھا نمونہ ہے۔ ان کے عاشقانہ مضامین میں بھی ایک نیا رنگ اور جدّت ملتی ہے۔ وہ اپنی طرز خاص کے موجد ہیں۔

# اقسام نظم

## غزل

نظم کی یہ قسم دوسری قسموں کے مقابلہ میں زیادہ رائج ہے۔ غزل اُردو شاعری کی جان ہے۔ غزل کے لغوی معنے "عورتوں سے باتیں کرنا" ہے لیکن اصطلاح شعراء میں غزل اس نظم کو کہتے ہیں جس میں عموماً عشق کی بلا انگیزی، معشوق کا حسن، عاشق کی حرماں نصیبی، وصل کی جستجو، وحشت وجنوں اور وصل و فراق کا ذکر نہایت ہی لطیف اور نازک پیرائے میں کیا جاتا ہے۔ غرض غزل میں رنج و غم، مسرت وخوشی فرحت وکلفت اور ہنسنا رونا، جیسے جذبے جو قدرتی طریقے سے انسان میں پیدا ہوتے ہیں ان کو موزوں اور مناسب الفاظ میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ عشق وحسن کے مضامین کے علاوہ تصوف، اخلاق وغیرہ کے مضامین بھی غزل میں لکھے جاتے ہیں۔

مضمون کے لحاظ سے غزل کا ہر شعر اپنے مطلب میں

مستقل اور مکمل ہوتا ہے۔ بعض دفعہ شعراء دو یا تین شعروں میں اپنا مطلب ادا کرتے ہیں اور ایسے اشعار کو مسلسل پڑھے بغیر مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ انہیں قطعہ کہتے ہیں جسکی علامت کے لئے اکثر "ق" لکھ دیا جاتا ہے۔

غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں جیسے ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اس میں "آساں" اور "انساں" قافیہ اور "ہونا" ردیف ہے غزل کے باقی اشعار میں دونوں مصرعوں کا ہم قافیہ و ہم ردیف ہونا ضروری نہیں۔ مگر شعر کے دوسرے مصرع میں بھی ردیف اور قافیہ کا ہونا ضروری ہے جو غزل کے مطلع میں استعمال ہوا ہے۔

غزل کے آخری شعر کو مقطع کہتے ہیں جس میں شاعر اپنا تخلص ظاہر کرتا ہے جیسے ؎

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

غزل کے اشعار کی تعداد پانچ سے سترہ تک ہوتی ہے اور ہر شعر اپنی جگہ مستقل و جداگانہ ہوتا ہے۔

---

# قطعات

قطعہ کے لغوی معنے ٹکڑے کے ہیں۔ لیکن شاعری کی اصطلاح میں اس سے وہ چند شعر مراد ہیں جن میں ایک شعر کا مطلب دوسرے شعر سے متعلق ہو۔ غرض قطعہ میں دو یا کئی مسلسل اشعار کو ملا کر پڑھنے سے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ ہر ایک قطعہ میں غزل کی طرح شعر کے دوسرے مصرعہ کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ قطعہ کے لئے اشعار کی تعداد کی کوئی قید نہیں۔ بعض دفعہ صرف دو شعروں کا قطعہ ہوتا ہے تو کبھی گیارہ، پندرہ یا بیس تیس شعر تک ہوتے ہیں۔

عام طور پر شاعر قطعات میں اخلاقی مضمون نصیحت و پند کی باتیں نظم کرتے ہیں۔ لیکن بعض شاعروں کے قطعات عاشقانہ رنگ بھی لئے ہوتے ہیں۔

# قصیدہ

قصیدے کے لغوی معنے مغز اور گودے کے ہیں اردو شاعری میں قصیدہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی تعریف، مدح یا ہجو کی جائے۔ قصیدہ اپنی ظاہری شکل میں غزل سے مشابہ ہے اور غزل کی طرح اس کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے۔ اس کے دونوں مصرعے عموماً ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ اس کے بعد غزل کی طرح ہر شعر کا دوسرا مصرعہ مطلع کا ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔

اس صنف میں شعرائے اردو بہت زیادہ طباعیاں دکھاتے ہیں اور اردو شاعری میں غزل کے بعد نفاست ندرت اور نزاکت کے اعتبار سے قصیدہ کا ہی نمبر ہے۔ غزل کے خلاف قصیدے میں شوکت الفاظ زیادہ دکھائی جاتی ہے۔

قصیدہ کی دو قسمیں ہیں (۱) خطابیہ :۔ خطابیہ قصیدہ میں شاعر شروع ہی سے مقصد بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً ممدوح کی تعریف مقصود ہو تو شاعر پہلے شعر سے ممدوح کو مخاطب کر کے مدح کا آغاز کر دیتا ہے۔

(۲) تمہیدیہ :۔ جس میں اول کوئی تمہید بیان کی جاتی ہے اور پھر مدعا و مقصد۔

اوّل اوّل قصیدے کے ابتدائی حصے میں عربی شعراء

حسن و شباب اور عشق و محبت کا ذکر کرتے تھے اور پھر اصل مقصد بیان کیا جاتا تھا۔ اس لیے قصیدے کی تمہید کو تشبیب کہتے تھے جس کے معنے ذکر شباب کے ہیں۔ اسی کی تتبع میں ہمارے اردو شعراء نے قصیدوں کی تمہیدوں میں موسم بہار و خزاں، ایام شباب، عاشقانہ و رندانہ مضامین حسینوں کی تعریف، شکایتِ گردوں ذکرِ محبوب اور بے ثباتی دنیا کا بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض تشبیہوں میں حکیمانہ خیالات اور اخلاقی مضامین کا بھی اظہار کیا جاتا ہے تشبیب کے مضمون کے لحاظ سے قصیدہ کو قصیدۂ بہاریہ، عشقیہ و عظیہ وغیرہ کہہ سکتے ہیں۔

غرض قصیدہ عام طور پر مدحیہ ہوتا ہے یا تمہیدیہ ایسے قصائد کے اولین لوازم میں ذیل کی چیزیں ہیں۔

(۱) مطلع (۲) تشبیب (۳) گریز جس کو مخلص اور رجوع بھی کہتے ہیں۔ یہ قصیدہ کی روح ہے جو تشبیب اور مدح کو ملاتی ہے اور شاعر اپنے حسن کمال سے تشبیب لکھتے لکھتے اپنے مقصد یعنی مدح کی طرف رجوع کرتا ہے (۴) مدح (۵) حسن طلب۔ مدح کے بعد شاعر اپنے مطلب پر آتا ہے اور اس میں اپنا مقصد بیان کرتا ہے (۶) خاتمہ۔ اس میں اکثر ممدوح کے لیے دعا کی جاتی ہے۔

# مثنوی

مثنوی لفظ "اثنا" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی دو کے ہیں مثنوی کے ہر شعر کے دو مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اور اسکا ہر شعر قافیہ اور ردیف کے لحاظ سے دوسرے شعر سے جداگانہ ہوتا ہے مگر مضمون کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ مثنوی میں اشعار کی کوئی تعداد مقرر نہیں۔ سیکڑوں سے ہزاروں تک بھی ہوسکتی ہے شعراء میں یہ صنف بہت مقبول رہی ہے۔ اس قسم کی نظم میں اکثر کوئی قصہ، داستان یا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن آج کل مثنوی میں زیادہ تر اخلاقی، قومی اور مذہبی مضامین لکھے جاتے ہیں۔

اردو کے مشہور مثنوی نویس میر، میر حسن، نسیم، قلق نواب مرزا شوق اور شوق قدوائی ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور مثنویاں میر حسن کی سحر البیان اور نسیم کی "گلزار نسیم" ہیں۔

# رباعی

اربع عربی میں چار کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے رباعی چار مصرعے والی نظم کو کہتے ہیں اس کو پہلے "دوبیتی" بھی کہتے تھے۔ رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ وردیف ہوتا ہے۔ کبھی تیسرے مصرعہ میں بھی قافیہ ہوتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں۔ رباعی کی خاص بحریں ہیں۔ رباعی میں جس قسم کا بھی مضمون بیان کیا جائے جدید، لطیف اور بلند ہونا چاہئے۔ الفاظ کا انتخاب اور بیان کی ترتیب رباعی کے حسن و کمال کے لئے ضروری ہے مضمون کے لحاظ سے رباعی کے پہلے دو مصرعے عام طور پر ذرا ہلکے ہوتے ہیں لیکن آخری دو مصرعے خصوصاً چوتھا مصرعہ نہایت ہی بلند اور زور دار ہوتا ہے اس میں رباعی کے تمام مضمون کا خلاصہ اور نچوڑ ہوتا ہے۔ جو سننے والے کو متحیر کر دیتا ہے۔ اسی لئے رباعی کا آخری مصرعہ حسن و خوبی کا معیار ہے۔

رباعی میں عموماً اخلاقی اور اصلاحی مضمون نظم کئے جاتے ہیں۔

# مسدس

مسدس کے معنی عربی میں چھ کے ہیں۔ شاعری اصطلاح میں مسدس اس نظم کو کہتے ہیں جس میں چھ چھ مصرعے ہوتے ہیں مسدس کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ ور دیف ہوتے ہیں۔ اور پھر پانچواں و چھٹا مصرعہ دوسرے قافیوں میں کہا جاتا ہے۔ مگر آخری کے یہ دونوں مصرعہ بھی آپس میں ہم قافیہ و ردیف ہوتے ہیں۔ یہ دونوں مصرعوں کو گرہ یا ٹیپ کا شعر کہتے ہیں۔ جو اوپر کے چار مصرعوں کا ہم مضمون ہوتا ہے۔ شعراء اپنا زور کلام اسی شعر میں دکھاتے ہیں۔ مسدس کی مثال میر انیس و دبیر وغیرہ کے مرثیوں میں ملتی ہے ان کے مرثیوں نے اردو شاعری کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔